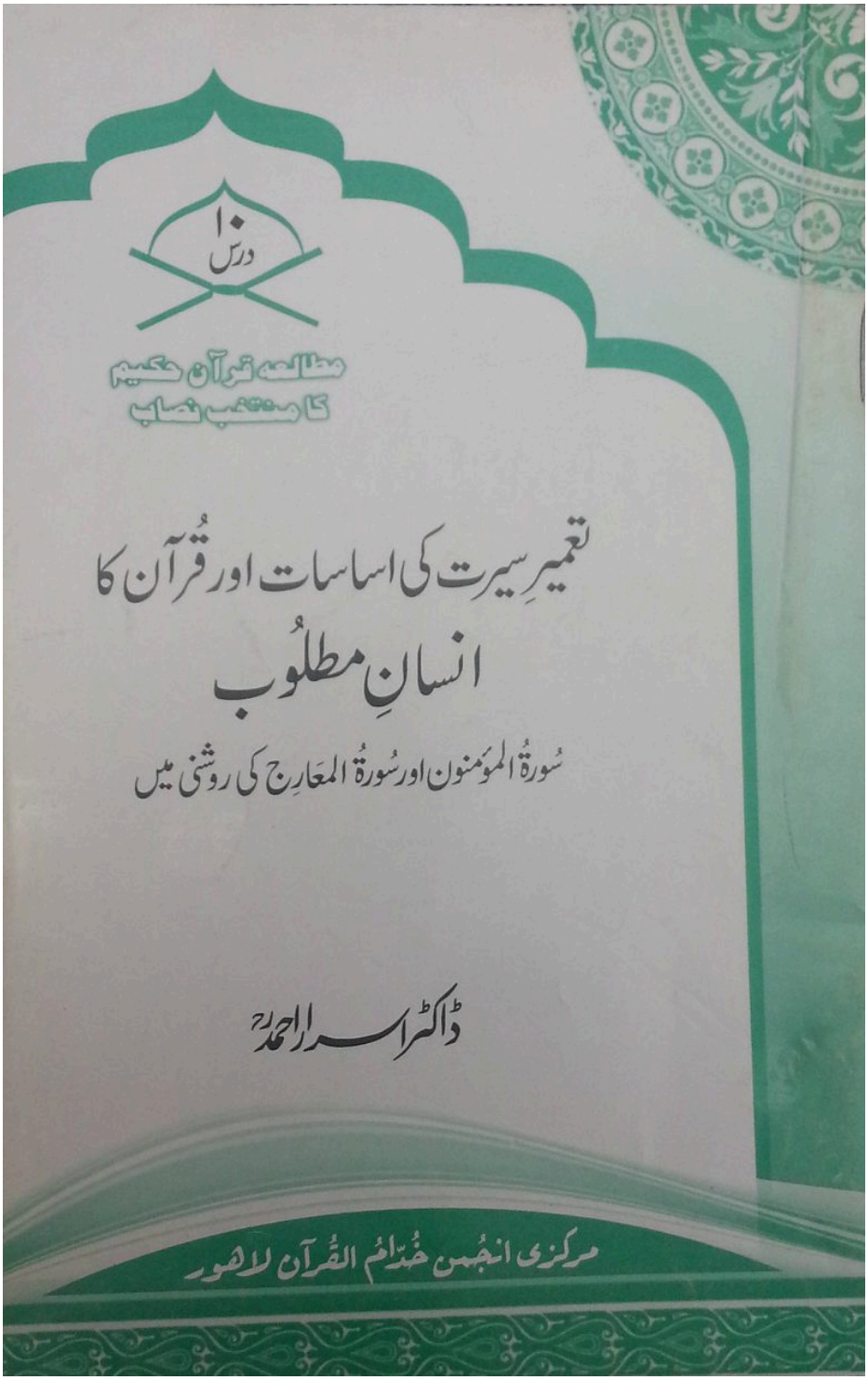

تعمیر سیرت کی اساسات درس-۱۰

ڈاکٹر اسرار احمد

تعمیرِ سیرت کی اساسات

اور قرآن کا انسانِ مطلوب

سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرجیم -- بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم
{قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِفُرُوۡجِہِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَاِنَّہُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡعٰدُوۡنَ ۚ﴿۷﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ﴿۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۘ﴿۹﴾ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾}
(المؤمنون)... صدق اللہ العظیم

’’کامیاب اور بامراد ہوئے اہلِ ایمان‘ جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں‘ اور جو بے کار اور بے مقصد باتوں سے احتراز کرتے ہیں‘ اور جو تزکیۂ نفس پر مسلسل کاربند رہتے ہیں‘ اور جو اپنی شرم گاہوں (یعنی اپنی شہوت کی) حفاظت کرتے ہیں‘ سوائے اپنی بیویوں یا باندیوں کے‘ لہٰذا (ان کے معاملے میں) ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ پس جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی پابندی کرتے ہیں‘ اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ

جو وارث بنیں گے‘ جنہیں جنت الفردوس کی وراثت ملے گی‘ وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔‘‘
یہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات ہیں‘ جن پر ہمارے اس منتخب نصاب کا دسواں سبق مشتمل

ہے۔ اسی سبق سے اس منتخب نصاب کے تیسرے حصے کا بھی آغاز ہوتا ہے' جو قرآن حکیم کے چند ایسے منتخب مقامات پر مشتمل ہے جن میں اعمالِ صالحہ کی کسی قدر تفصیل بیان ہوئی ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلو اُجاگر کیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس سے قبل اس سلسلۂ درس میں اب تک ہونے والے تمام دروس میں بلا استثناء ایمان کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلوؤں کا بھی ذکر ہوا ہے ' اور ایمان کے عملی تقاضے' ایمان کے عملی لوازم' ایمان کے عملی اور اخلاقی نتائج قریباً تمام اسباق میں ہمارے سامنے آتے رہے ہیں' لیکن اس حصے میں بنیادی طور پر ہماری توجہ اعمالِ صالحہ ہی کی بحث پر مرتکز رہے گی اور اس میں جو تدریج پیشِ نظر ہے اسے آپ پہلے ہی سے ذہن نشین فرما لیں۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے ہم ایک فرد' ایک شخص اور ایک انسان کی سیرت و کردار میں جو اوصاف مطلوب ہیں' ان کے اعتبار سے قرآن مجید کے بعض مقامات کا مطالعہ کریں گے۔ گویا ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ قرآن کا انسانِ مطلوب کیسا ہوتا ہے ! جس کی نقشہ کشی علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں ''مردِ مؤمن'' کے حوالے سے کی ہے اس کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں ! اس کی سیرت و کردار میں کون سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں !

پھر یہ بحث ہمارے اس سلسلۂ سبق میں دو سطحوں پر آئے گی۔ ایک تو یہ کہ تعمیرِ سیرت کے لیے اساسات کون سی ہیں۔ یعنی وہ بنیادیں کون سی ہیں جن پر ایک اعلیٰ سیرت و کردار کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر عمارت کی ایک بنیاد ہوتی ہے' اسی بنیاد پر وہ عمارت اٹھتی ہے اور اسی بنیاد کے مستحکم ہونے پر اس عمارت کے استحکام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ لہٰذا تعمیرِ ذات یا تعمیرِ سیرت یا اگر علامہ اقبال کی اصطلاح مستعار لی جائے تو تعمیرِ خودی کے لیے قرآن مجید کیا لائحۂ عمل پیش کرتا ہے اور اس کی اساسات کیا

ہیں ! پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ جب ان بنیادوں پر ایک انسانی شخصیت کی بتمام و کمال تعمیر ہو جاتی ہے تو اس کے امتیازی خدوخال کیا ہوتے ہیں ! اس میں جو حسن اور جو دلکشی پیدا ہوتی ہے وہ کن اوصاف کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ مردِ مؤمن کے بارے میں علامہ اقبال کا ایک شعر ہے : ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مؤمن !
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مؤمن

تو مؤمن کی شخصیت کی جو دل آویزی ہے وہ کون کون سی خصوصیات اور اس کے کون کون سے اوصاف پر مبنی ہے !

پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ جب ایک فرد سے آگے بڑھ کر ایک خاندان وجود میں آتا ہے تو خاندان اور

عائلی زندگی کے سلسلہ میں قرآن مجید ہمیں کیا رہنمائی اور اس کی عملی تشکیل کے لیے کیا اصول دیتا ہے ! قرآن مجید کے نزدیک ایک اچھا خاندان کون سا ہے ! اس کے خصائص و اوصاف کیا ہیں !

اس سے ہم جب آگے بڑھیں گے تو دیکھیں گے کہ خاندانوں کے مجموعے سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس انسانی معاشرے میں کن اَقدار و اوصاف کو قرآن مجید چاہتا ہے کہ وہ نافذ اور رائج ہوں ! قرآن مجید کو کن اَقدار (values) کی ترویج ایک معاشرے میں اصلاً مطلوب ہے اور ازروئے قرآن وہ کون سی سماجی خرابیاں اور برائیاں (social evils) ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے سے دُور رہیں اور اُن کا استیصال کیا جائے۔ پھر اس عمل صالح کی بحث کی بلندترین سطح یہ ہوگی کہ ملت و ریاست کی سطح پر، حکومت اور نظامِ حکومت کی سطح پر قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے !

اس ضمن میں یہ ہمارا پہلا سبق ہے، جس میں دراصل وہ اساسات بیان ہوئی ہیں اور وہ بنیادیں معین کی گئی ہیں جن پر ایک مردِ مؤمن کی شخصیت کی تعمیر ہو سکتی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ انسانی سیرت و کردار کی پختگی کے لیے جو لوازم ہیں، ان کا تعین کیا گیا ہے۔

5

علامہ اقبال کا یہ شعر آپ کے ذہن میں ہو گا کہ : ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

اس سبق میں ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو کر آئے گی کہ انسانی سیرت و کردار کی پختگی اور استحکام کے لیے کون سی محنت ضروری ہے، اور وہ کون سی مشقت اور ریاضت ہے جس کی طرف قرآن مجید رہنمائی کرتا ہے !

بندۂ مؤمن کے مطلوبہ اوصاف

اب آپ نوٹ کیجیے کہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں چند اوصاف سلسلہ وار بیان ہوئے ہیں۔ ان میں اہم ترین وصف ہے صلوٰۃ، جس کا ترجمہ ہم عام طور پر ''نماز'' کرتے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ اوصاف کی اس فہرست میں آغاز بھی نماز سے ہوا ہے اور اختتام بھی۔ آغاز میں فرمایا گیا: {قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿ ۱ ﴾ الَّذِیْنَ ہُمْ فِیْ صَلَاتِہِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿ ۲ ﴾} ''کامیاب ہو گئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں''۔ پھر چند اوصاف بیان کرنے کے بعد آخری وصف بیان ہوا: {وَ الَّذِیْنَ

ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۹﴾} ’’اور (کامیاب ہو گئے) وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں‘‘ انہیں ضائع نہیں ہونے دیتے۔ معلوم ہوا کہ اس فہرست میں اوّل بھی نماز ہے‘ آخر بھی نماز ہے۔ اس سے یہ خصوصی رہنمائی حاصل ہوئی کہ تعمیرِ سیرت کا جو قرآنی پروگرام اور جو لائحۂ عمل ہے‘ اس میں نماز کا نظام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

آگے ارشاد ہوا: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۹﴾} ’’اور جو بے کار اور بے مقصد باتوں سے احتراز کرتے ہیں‘‘۔یعنی ان کا دوسرا وصف ہے بے کار باتوں سے احتراز کرنا‘ بچنا‘ دامن بچائے رکھنا۔ انسان اپنے وقت کی قدر و قیمت کا احساس کرے اور اپنے ہر ہر لمحہ کو مفید‘ بامقصد اور نتیجہ خیز بنائے۔ انسان کا وقت یا تو اِس حیاتِ دُنیوی کی کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صرف ہو رہا ہو‘ یا اپنی حیاتِ معنوی کی تطہیر اور

اس کے تزکیہ کے لیے صرف ہو رہا ہو‘ یا حیاتِ اُخروی کے لیے کچھ کمانے اور بنانے میں صرف ہو رہا ہو۔ ان کاموں کے سوا وقت کا صرف ضیاع بھی ہے اور زیاں بھی۔

تیسرا وصف آتا ہے: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ﴿۴﴾} ’’اور وہ لوگ جو زکوٰۃ پر عمل کرتے رہتے ہیں‘‘۔ یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں عموماً زکوٰۃ کے ساتھ لفظ ’’ اِیۡتَآءٌ ‘‘ آتا ہے۔ جیسے اٰتَی الزَّکٰوۃَ ‘ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ ‘ لیکن یہاں آپ نے دیکھا کہ بالکل مختلف فعل استعمال ہوا ہے: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ﴿۴﴾} یہاں فٰعِلُوۡنَ یہ مفہوم ادا کر رہا ہے کہ مسلسل کوشاں رہتے ہیں‘ مسلسل کاربند رہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ تزکیۂ نفس کے لیے ان کی جدوجہد مسلسل جاری رہتی ہے۔

چوتھا وصف ہے اپنے جنسی جذبہ یعنی اپنی شہوت پر کنٹرول (sex discipline) کہ اس کی تسکین کے لیے قرآن مجید نے جو جائز راہ معین کر دی ہے‘ اس پر اکتفا کیا جائے۔ اس کے بارے میں یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ ان جائز راہوں سے اگر کوئی اپنے اس جنسی جذبہ کی تسکین کرتا ہے تو اس میں ہرگز کوئی ملامت والی بات نہیں ہے۔ جنسی جذبہ (sexual instinct) فی نفسہٖ شر نہیں ہے‘ برائی (evil) نہیں ہے۔ اس کا غلط استعمال درحقیقت برائی ہے۔ اگر اس میں انضباط (discipline) ہو اور اِس میں بے راہ روی اور کجروی (pervertion) نہ ہو‘ یعنی اس میں نہ تو بے قابو ہونے کی کیفیت پیدا ہو اور نہ جائز راہوں سے انحراف ہو‘ تو فی نفسہٖ یہ کوئی ملامت والی بات نہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِفُرُوۡجِہِمۡ حٰفِظُوۡنَ ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَاِنَّہُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ﴿۶﴾}

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں جائز راستوں کی اجازت کے لیے غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ کا اسلوب کیوں اختیار کیا

لیا ! اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں تجرد کی زندگی بسر کرنا اور اپنے جنسی جذبہ کو' جو فطرت اور جبلت میں ایک نہایت قوی جذبہ ہے' کچلنا ایک اعلیٰ ترین روحانی قدر قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام دین

7

فطرت ہے' چنانچہ وہ اس فطری و جبلی جذبہ کو بالکلیہ کچلنے اور دبانے کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منشاء و مدعا یہ ہے کہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے جائز اور حلال راہیں اختیار کی جائیں۔ نکاح کو اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنتوں میں سے ایک سنت قرار دیا ہے۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے یہ حدیث سنی ہو گی جو ہر خطبۂ نکاح میں پڑھی جاتی ہے : ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) (۱) ''نکاح میری سنت میں سے ہے''۔ اسی حدیث کا ایک حصہ یہ بھی ہے جو عام طور پر نہیں پڑھا جاتا : ((فَمَنْ لَّمْ یَعْمَلْ بِسُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) ''پس جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ تاہم اس کے ساتھ ایک دوسری طویل حدیث کا یہ آخری حصہ پڑھا جاتا ہے : ((فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) (۲) ''تو جس نے میری سنت سے اعراض کیا (جس کو میری سنت پسند نہیں) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

اس مقام پر جہاں جنسی تسکین کے لیے جائز راہوں کی طرف رہنمائی کی گئی وہاں اس کے ساتھ ہی فرما دیا گیا:

{فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿ ۷ ﴾} ''تو جو کوئی ڈھونڈے (اختیار کرے' پسند کرے) اس کے سوا کوئی اور راہ تو وہی لوگ ہیں حد سے بڑھنے والے (یعنی طاغی اور باغی)''۔

اگلی آیت میں دو اوصاف آئے۔ گویا پانچواں وصف امانتوں کی پاس داری اور چھٹا وصف ایفائے عہد۔ فرمایا:

{وَ الَّذِیْنَ ہُمْ لِاَمٰنٰتِہِمْ وَ عَہْدِہِمْ رٰعُوْنَ ۚ﴿ ۸ ﴾} ''اور وہ لوگ (فلاح پا گئے) جو اپنی امانتوں اور عہد وپیمان کی پاس داری کرتے ہیں''۔ امانت داری اور ایفائے عہد کے معاملات میں چوکس رہتے ہیں۔

یہ چھ اوصاف گویا corner stones ہیں۔ یہ وہ اساسات اور بنیادیں ہیں جن پر انسانی شخصیت کی اُس رخ پر تعمیر کا عمل مبنی ہو سکتا ہے جس رُخ پر اللہ تعالیٰ کو انسان

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب النکاح' باب ما جاء فی فضل النکاح۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔ وصحیح مسلم' کتاب النکاح' باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسہ الیہ ...

8

لی شخصیت کی تعمیر پسند ہے۔ تعمیرِ ذات' تعمیرِ سیرت' تعمیرِ کردار کے بھی مختلف معیارات ہوسکتے ہیں۔ مختلف نظریات اور مختلف فلسفوں پر مبنی انسانی سیرت و کردار کے مختلف ہیولے لوگوں کے ذہنوں میں ہو سکتے ہیں' لیکن

اللہ کے انسانِ مطلوب یا قرآن کے مردِ مؤمن کی جو سیرت و کردار اس کے خالق و مالک اور پروردگار کو مطلوب ہے اس کی تعمیر کے لیے یہ چھ ناگزیر' لابدی' اٹل (inevitable) اساسات ہیں ان چھ اوصاف کے بیان کے بعد پھر نماز کا ذکر فرمایا گیا 'تاکہ دین میں نماز کی جو اہمیت ہے وہ مستحضر رہے اور ایک مردِ مؤمن جان لے کہ تعمیرِ سیرت کا اہم ترین عامل نماز کی حفاظت ہے۔ چنانچہ فرمایا: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۘ﴿۹﴾} آخر میں ان لوگوں کو جو اپنے اندر یہ اوصاف مستقل طور پر پیدا کر لیں اور ان اساسات پر اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کر لیں' بشارت دی گئی ہے کہ یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے' جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے: {اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾}

سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات کا تقابل

قرآن حکیم کا یہ اسلوب ہے کہ اس میں جو مضامین بتکرار و اعادہ یعنی بار بار آئیں گے گویا ان کی اہمیت مسلم ہوتی چلی جائے گی۔ چنانچہ انتیسویں (۲۹) پارے میں سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ میں بھی تعمیرِ سیرت کے یہی لوازم بیان ہوئے ہیں۔ ان دونوں مقامات کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کس قدر مشابہت ہے۔ سورۃ المعارج میں فرمایا گیا : {اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا ﴿۱۹﴾} ''یقینا انسان تھڑدلا (اور کم ہمت) پیدا ہوا ہے''۔ {اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿۲۰﴾} ''جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے''۔ فریاد کرتا ہے' نالہ و شیون کرتا ہے۔ {وَّ اِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ﴿۲۱﴾} ''اور جب اس کو خیر ملتا ہے (مال و دولت ہاتھ آتی ہے' اللہ تعالیٰ نعمتیں دیتا ہے) تو (اُن کو) روک روک کر رکھتا ہے''۔ سینت سینت کر رکھتا ہے' دوسروں تک انہیں پہنچنے نہیں دیتا۔ یہ دراصل انسان کی سیرت کی اس خامی کی طرف اشارہ ہے جس سے

انسان کو رُستگاری اور آزادی دلانا اس پروگرام کا مقصد ہے۔

آگے فرمایا: {اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿۲۲﴾} ''سوائے اُن کے جو نماز کے خوگر اور عادی ہوگئے ہوں''۔ یہاں نماز کی اتنی اہمیت سامنے آئی کہ وہاں جو {قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾} کے الفاظ وارد ہوئے تھے ان کے بجائے یہاں لفظ ''مُصَلِّیۡنَ'' آیا۔ گویا مؤمن اور نمازی مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں۔ آگے فرمایا: {الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾} ''جو اپنی نمازوں پر مداومت کرنے والے ہیں''۔ ہمیشگی اختیار کرتے ہیں۔

آگے فرمایا: {وَ الَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۲۵﴾} ''اور وہ لوگ جن کے اموال میں معین اور معلوم حق ہے مانگنے والوں کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو (کسی سبب سے) محروم ہو جائیں''۔ یہ گویا سورۃ المؤمنون کے الفاظ: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾} کے مترادف الفاظ ہیں۔

آگے فرمایا: {وَ الَّذِیۡنَ یُصَدِّقُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۲۶﴾} ''اور وہ لوگ جو روزِ جزا (یوم قیامت) کی تصدیق

کرتے ہیں‘‘۔ {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّہِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۷﴾} ’’اور وہ لوگ جو اپنے ربّ کے عذاب سے لرزاں وترساں رہتے ہیں (ڈرتے رہتے ہیں)‘‘۔ {اِنَّ عَذَابَ رَبِّہِمۡ غَیۡرُ مَاۡمُوۡنٍ ﴿۲۸﴾} ’’اور واقعتا اُن کے ربّ کا عذاب ایسی ہی چیز ہے جس سے نچنت نہیں ہوا جا سکتا‘‘۔جس سے بے خوف ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان تین آیات کے بارے میں مَیں عرض کروں گا کہ ان کا تعلق ’’اِعراض عن اللّغو‘‘ سے ہے۔ یہ ایمان بالآخرت ہے جس کے نتیجے میں دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو جاتا ہے‘ اور اس کا اصل ہے ’’اِعراض عَنِ اللّغو‘‘ یعنی بیکار باتوں سے دامن بچانا‘ پہلو تہی کرنا۔ اس کی قدرے وضاحت اِن شاء اللہ اگلے صفحات میں آئے گی۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ بعینہٖ وہ الفاظ دوبارہ آ رہے ہیں جو سورۃ المؤمنون (آیات ۵تا۸) میں آئے تھے : {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِفُرُوۡجِہِمۡ حٰفِظُوۡنَ ﴿۲۹﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَاِنَّہُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ

فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡعٰدُوۡنَ ﴿۳۱﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ ﴿۳۲﴾} البتہ یہاں ایک چیز کا اضافہ کیا گیا‘ اور وہ یہ کہ امانت اور عہد کے ضمن میں شہادت پر قائم رہنا‘ گواہی پر قائم رہنا۔ چنانچہ فرمایا: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِشَہٰدٰتِہِمۡ قَآئِمُوۡنَ ﴿۳۳﴾} ’’اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں‘‘۔ آخر میں وہی نماز کا ذکر پھر آیا: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۳۴﴾} ’’اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں‘‘۔ جیسے وہاں اوّل و آخر نماز‘ ویسے ہی یہاں اوّل و آخر نماز۔

آگے فرمایا: {اُولٰٓئِکَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّکۡرَمُوۡنَ ﴿۳۵﴾} ’’یہ ہیں وہ لوگ جو جنتوں میں ہوں گے اکرام و اعزاز کے ساتھ‘‘۔ سورۃ المؤمنون میں فرمایا تھا: {اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾} یہاں اِن الفاظ میں بشارت دی گئی :{اُولٰٓئِکَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّکۡرَمُوۡنَ ﴿۳۵﴾}

انسانی شخصیت میں کمزوری کے پہلو

سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت {قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾} میں ایک اصطلاح وارد ہوئی ہے: ’’فلح‘‘۔ یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے‘ مثلاً: {اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ} اور سورۃ المعارج کا جو حصہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے مشابہ ہے‘ اس کے آغاز میں الفاظ آئے : {اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا ﴿۱۹﴾} ’’بے شک انسان تھڑدلا (اور کم ہمت) پیدا کیا گیا ہے‘‘۔ اس کی مزید وضاحت ہوئی : {اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿۲۰﴾} ’’جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے‘‘۔نالہ و شیون سے کام لیتا ہے‘ فریاد کرتا ہے‘ چیختا چلاتا ہے۔ {وَّ اِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ﴿۲۱﴾} ’’اور جب اسے خیر (یا بھلائی یا دولت) ملتی ہے تو اسے سینت سینت کر رکھتا ہے‘‘۔ سمیٹ سمیٹ کر اپنے ہی پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے‘ اپنے دوسرے ابناءِ نوع کو اس میں حصہ دار بنانے کی ہمت نہیں رکھتا۔

چنانچہ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ انسان کی شخصیت میں ضعف اور کمزوری کے وہ کون کون سے پہلو ہیں جن کی نشاندہی قرآن مجید نے کی ہے اور جن کے ازالہ کے لیے انسان کو

محنت و مشقت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک بڑی عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک طرف قرآن مجید انسان کی عظمت کو نمایاں (emphasize) کرتا ہے کہ یہ بہت اعلیٰ خلقت کا حامل ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید انسانی خلقت کے بعض خلا اور اس کی بعض کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ ایک طرف بلندیاں ہیں اور ساتھ ہی پستیاں ہیں۔ جیسے سورۃ التّین میں فرمایا گیا:

{لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۪﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾} ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے اُلٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا''۔ اس کی بہت خوبصورتی سے شیخ سعدی رحمہ اللہ علیہ نے ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وَز حیوان

یہ انسان' آدمی زادہ' حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد عجیب مرکب وجود کا حامل ہے۔ یہ گویا چوں چوں کا مربہ ہے۔ اس میں ایک جانب بڑی بلندیاں ہیں' وہ بلندیاں جو اسے ملائکہ کا ہم پلہ ہی نہیں مسجود بناتی ہیں۔ دوسری طرف اس میں ایسی پستیاں ہیں کہ یہ خالص حیوانات کی سطح پر بھی گر جاتا ہے۔ پس اس میں ملکوتیت اور حیوانیت کے اوصاف بیک وقت موجود ہیں۔ اگر ہم خود کچھ دروں بینی کی عادت ڈالیں اور اپنے اندر بھی جھانکا کریں تو ہمیں خود محسوس ہو گا کہ یہ دو متضاد تقاضے ہمارے اندر موجود ہیں۔ خیر و شر کے عواطف و میلانات بیک وقت ہمیں اپنے باطن میں محسوس ہوتے ہیں۔ ایک طرف ہمارے اندر نیکی' بھلائی' علوِ ہمت اور کردار کی بلندی کی طرف رجحان بھی موجود ہے اور دوسری طرف پستی کی طرف میلان بھی خود ہمارے اندر موجود ہے۔ اسے ہم تعبیر کرتے ہیں کشمکش خیر و شر سے' جس کے داعیات اور عواطف و میلانات ہمارے اپنے اندر موجود ہیں۔ اسی کو علامہ' اقبال نے ایک مقام پر ''معرکۂ روح و بدن'' سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش !
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسہ !
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

فرائڈ دورِ جدید کا ایک بہت بڑا ماہرِ نفسیات شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے بہت سے نظریات گمراہ کن بھی ہیں‘ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے انسانی نفسیات کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرائی میں اتر کر کیا ہے۔ اس کے یہاں انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ضمن میں جو اصطلاحات ملتی ہیں ان میں ایک طرف "IDD" اور "LIBIDO" ہے‘ یعنی حیوانی جبلتیں اور حیوانی تقاضے (animal instincts) ‘ اوردوسری طرف "EGO" اور "SUPER EGO" یعنی ’’انا‘‘اور ’’انائے کبیر‘‘ بھی‘موجود ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو رفعت اور اخلاق کی بلند منزلوں کی طرف کھینچتی ہیں۔

قرآن مجید نے بھی ’’نفس‘‘کو کہیں تو ایک وحدت کی حیثیت سے لیا ہے تو وہ پستی کا مظہر ہے اور اس کے مقابلہ میں قلب و روح کو بلندی اور رفعت کا مظہر قرار دیا

ہے۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ نفس ہی کو ایک جامع اصطلاح کے طور پر لے کر اس کی تین حالتوں اور کیفیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ان میں سے پہلی ’’نفس ِامارہ‘‘ ہے ‘یعنی اس میں برائی‘ بے حیائی‘ شہوت‘ خواہشات اور حیوانی جبلتوں ہی کی طرف سارا میلان اور رجحان ہے۔ چنانچہ تیرہویں پارے کی پہلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل ہوئے ہیں:

{وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ} (یوسف:۵۳)

’’یقینا میں کچھ اپنے نفس کی براء ت نہیں کر رہا ہوں‘ نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے۔‘‘

لیکن قرآن مجید دوسری کیفیت ’’نفس لوامہ‘‘کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے اور اسے وقوعِ قیامت پر بطورِ شہادت پیش کیا ہے ‘جس کا ہم سورۃالقیامہ میں مطالعہ کر چکے ہیں: {وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ ﴿۲﴾} چنانچہ برائی پر ملامت کرنے والی چیز بھی انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔

پھر ’’نفس مطمئنہ‘‘ ایک بلند ترین کیفیت ہے۔ جب آدمی زادہ حیوانیت سے

آزادی اور رُستگاری حاصل کر کے انسانیت کے بلند مقام پر متمکن ہو جائے‘ قائم ہوجائے‘ جم جائے‘ تو یہ ہے نفس ِمطمئنہ‘ جس کا ذکر سورۃ الفجر کے آخر میں ہے :

{یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ﴿۲۷﴾ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴿۲۸﴾}

''اے نفسِ مطمئن ! چل اپنے ربّ کی طرف 'اس حال میں کہ تو (اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے ربّ کے نزدیک) پسندیدہ ہے''۔ لہٰذا یہ ہیں وہ متضاد میلانات و رجحانات جو انسان کے اندر موجود ہیں۔

مزید توجہ کیجیے۔ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان مسجودِ ملائک ہے۔ قرآن مجید میں سات مرتبہ اس کا ذکر ہے کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ مزید برآں سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے :

{وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾}

''اور ہم نے بنی آدم کو بڑی عزت بخشی ہے 'اور ہم اسے بحر و بر میں اٹھائے پھرتے ہیں' اور ہم نے اسے پاکیزہ رزق دیا ہے اور ہم نے جو کچھ بنایا ہے اس میں سے بہتوں پر اسے فضیلت عطا کی ہے''۔ یہ بھی اس کا اعزاز و اکرام ہے۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے : {لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿۴﴾} (التین) ''ہم نے انسان کو بہترین خلقت پر پیدا کیا ہے''۔ اور سورہ صٓ کی آیت ۷۵ میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں : {لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ} یعنی اس انسان کو تو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔ (۱)

اور اگرچہ قرآن میں تو اس کا ذکر نہیں ہے' لیکن تورات میں یہ مضمون بھی آیا ہے :

---

(۱) قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے الفاظ بھی آئے ہیں جو جسم کے مختلف اعضاء کے لیے بولے جاتے ہیں۔ جیسے ہاتھ' چہرہ' پنڈلی' مٹھی' وغیرہ ان الفاظ سے ہم یہ مراد لیں گے کہ کوئی حقیقتِ معنوی ہے جس کو اِن الفاظ سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ اپنے جسموں پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ یا اپنی طرح کا اللہ تعالیٰ کا کوئی چہرہ یا اللہ تعالیٰ کی آنکھ ہم نہیں مان سکتے۔ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیت سے پاک ہے' اعلیٰ ہے' ارفع ہے اور منزہ ہے ! ''سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ''البتہ اجمالاً جب یہ الفاظ آئے ہیں تو ہمارا ایمان رہے گا کہ کوئی حقیقتِ معنوی ہے جس کو اِن الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"And God created man in His own image"

اور بعینہٖ یہ مضمون حدیثِ نبویؐ میں بھی موجود ہے : ((خَلَقَ اللّٰہُ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ)) (۱) ''اللہ نے آدم کی تخلیق اپنی صورت پر فرمائی ہے''۔ اس کو بلاتشبیہ خیال کیجیے !

اب ایک طرف تو انسان کی عظمتوں کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف قرآن یہ بھی بتاتا ہے : {وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾} (النساء) ''انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے'' ۔ {اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾} (المعارج) ''یقینا انسان تھڑدلا (کم ہمت) پیدا کیا گیا ہے''۔ {خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ} (الانبیائ ۲۱:۳۷) ''انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے''۔ (یعنی اس کی خلقت میں جلد بازی کا مادہ ہے' جلد بازی اس کی طبیعت اور سرشت میں ودیعت شدہ ہے۔ کہیں فرمایا

جاتا ہے:

{زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّہَبِ وَ الْفِضَّۃِ وَ الْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ} (آل عمران:۱۴)

یعنی انسان کے لیے عورتوں سے دلچسپی اور ان کی طرف شہوت کا میلان' اولاد کی محبت اور مال و اسبابِ دنیا کی مختلف صورتوں کی طرف بھی ایک کشش ہے جو اس میں طبعی طور پر ودیعت کر دی گئی ہے۔ یہ ہے انسان کی حقیقت ازروئے قرآن۔

قرآن کا تصوّرِ فلاح

اب غور طلب اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی ان خامیوں' کمزوریوں اور اپنی خلقت کے ضعف کے حامل ان پہلوؤں سے کشمکش اور کشاکش کر کے' محنت و مشقت اور ریاضت کر کے اپنی جو اصل بلندی اور رفعت ہے اسے attain کرنا ہے' اس کا جو اصل مرتبہ اور مقام ہے اس کو حاصل کرنا ہے۔ جیسے سورۃ التین میں فرمایا:

{لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ۴ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ ۵ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ} ''ہم نے انسان کو اعلیٰ ترین تخلیق پر پیدا فرمایا' پھر اسے

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاستئذان' باب بدء الاسلام' وصحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب النھی عن ضرب الوجہ۔

نچلوں میں سب سے نیچے لوٹا دیا' سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے...''۔ پس اس جدوجہد کا عنوان ''ایمان اور عملِ صالح'' ہے جس کے ذریعے سے انسان اپنی پستی سے اُبھر کر اپنے اس مقامِ بلند تک پہنچتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بالقوۃ (potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ اس محنت و مشقت اور اس ریاضت کا نام شریعت' طریقت اور سلوک ہے۔ پستی سے بلندیوں تک پہنچنے کے عمل کے لیے قرآن مجید جامع ترین لفظ استعمال کرتا ہے: ''فلح''۔ اب غور کیجیے کہ اس لفظ کا لغوی مفہوم کیا ہے! ہم عام طور پر اس کا ترجمہ کر دیتے ہیں کامیابی' بامراد ہونا۔ لیکن '' فَلَحَ'' جو عربی زبان میں سہ حرفی مادہ (ف ل ح) ہے' اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو توڑنا' پھاڑنا' کسی چیز کو پھاڑ کر اُس میں سے کوئی اور چیز برآمد کرنا۔ چنانچہ جیسے ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ ''لوہے کو لوہا کاٹتا ہے'' اس طرح عربی زبان کی ضرب المثل ہے: اِنَّ الْحَدِیْدَ بِالْحَدِیْدِ یُفْلَحُ ''لوہا لوہے ہی سے کاٹا جاتا ہے''۔ اسی طرح جدید عربی میں فلاّح کسان کو کہتے ہیں' کیونکہ وہ اپنے ہل کی نوک سے دھرتی کے سینہ کو چیرتا ہے۔ ہل اس کا

آلۂ فلح ہے جس سے کسان‘ کاشت کار‘ فلاح زمین میں شگاف ڈالتا ہے۔
اب اس لفظ کو ذہن میں رکھیے اور غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ انسانی شخصیت کے اندر ایک معنوی حقیقت مضمر ہے‘ جو اس کی اصل شخصیت ہے‘ جو اس کی خودی ہے‘ جو اس کی انا ہے۔ کوئی شخص جب ’’میں‘‘ کہہ کر اپنی طرف اشارہ کرتا ہے تو کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے ! غور طلب بات ہے کہ یہ میرا ہاتھ ہے‘ یہ میرے پاؤں ہیں‘ یہ میری آنکھیں ہیں‘ یہ میرے کان ہیں‘ یہ میرا سر ہے‘ یہ میرا بدن ہے‘ تو میں کون ہوں جس کی یہ تمام چیزیں ہیں؟ یہ میں‘ انا‘ یا خودی انسان کی اصل حقیقت اور اس کی اصل معنوی شخصیت ہے۔ لیکن یہ میں‘ یا انا‘ یا خودی چند مادی اور شہوانی غلافوں میں لپٹی ہوئی ہے‘ جو انسان کے حیوانی وجود کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں۔ وہ حیوانی وجود اسے پستیوں کی طرف کھینچتا ہے۔ سارے حیوانی داعیات (animal instincts) اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں جو اس کو بلندیوں کی طرف نہیں جانے دیتے‘ بلکہ پستیوں کی طرف کھینچتے ہیں۔

اس سے رُستگاری حاصل کرنا اور اپنے مادی اور شہوانی غلافوں کو پھاڑ کر اس میں سے اپنی اصل معنوی شخصیت کو برآمد کرنا اور اس کو نشوونما دینا‘ یہ عمل فلح ہے۔ جیسے آم کی گٹھلی پھٹتی ہے تو اس میں سے آم کا پودا برآمد ہوتا ہے اور جیسے ایک بیج شق ہوتا ہے تو اس میں سے پتیاں نکلتی ہیں۔ عربی زبان میں فلح کے بہت ہی قریب کا لفظ ’’فلق‘‘ ہے۔ فَلَقَ (ف ل ق) کے معنی بھی پھاڑنا کے ہیں‘ جو قرآن میں صبح کے لیے آتا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۶ میں اللہ تعالیٰ کو {فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ} قرار دیا گیا ہے کہ وہ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کرتا اور دن کی روشنی برآمد کرتا ہے۔ اور فرمایا: {اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰی ؕ} (الانعام:۹۵) ’’بالتحقیق اللہ دانوں(بیجوں) اور گٹھلیوں کا پھاڑنے والا ہے‘‘۔ وہ ان کو پھاڑتا ہے اور ان میں سے پودے برآمد کرتا ہے۔ تو فلاحِ انسانی کیا ہے؟ یہ کہ انسان کا اپنے مادی اور شہوانی میلانات ورجحانات‘ اپنے حیوانی تقاضوں اور جبلتوں کے خول کو پھاڑ کر اپنی معنوی شخصیت‘ اپنی خودی اور اپنی انا کو برآمد کرنا‘ اس کو پروان چڑھانا اور اس کی تعمیر کرنا۔ یہ ہے انسان کی فلاح ازروئے قرآن حکیم۔
حکمت چونکہ انسان کی ایک مشترک متاع ہے اس لیے میں یہاں اپنشد کے ایک جملہ کا انگریزی ترجمہ پیش کر رہا ہوں:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths which encompass his real self."

’’انسان اپنی نادانی اور جہالت میں اپنے آپ کو ان مادی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے جن کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر اور پنہاں ہے اور بایں وجوہ اس کی اصل حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے‘‘۔
قرآن حکیم میں سورۃ الحشر میں فرمایا گیا:
{وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰىہُمْ اَنْفُسَہُمْ ؕ} (آیت:۱۹)

''اور اُن لوگوں کے مانند نہ بن جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے (اپنی حقیقت اور اپنی عظمت سے) غافل کر دیا''۔
یہ ہے انسان کی انفرادی شخصیت اور سیرت و کردار کی تعمیر کا قرآنی پروگرام اورلائحہ عمل جس کا اصل مقصد فلاحِ انسانی ہے۔ یعنی انسانی شخصیتوں کے خام مال سے ایک

تعمیرشدہ اور مستحکم سیرت و کردار وجود میں آئے' جس کا حوالہ علامہ اقبال کے اس شعرمیں ہے: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو !

اور اس سے بھی زیادہ پیارے انداز میں اس بات کو علامہ اقبال نے فارسی میں بایں طور ادا کیا ہے: ؎

بانشہ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن !

آپ کو معلوم ہے کہ اگر ریت کا ایک گولہ بنا کر اسے آپ کسی شیشہ پر دے ماریں تو شیشہ نہیں ٹوٹے گا' اس کا کچھ نہیں بگڑے گا 'بلکہ وہ ریت خود ہی بکھر جائے گی۔ لیکن اسی ریت کو آپ پکا لیں' پختہ کر لیں اور وہ اینٹ کی شکل اختیار کر لے تو اب اس کی ضرب کاری اور نتیجہ خیز ہو گی۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ' جن کو علامہ اقبال اپنا مرشد معنوی کہا کرتے تھے' اسی بات کو بڑے سادہ لیکن پُراثر انداز میں یوں ادا کیا ہے : ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل ' جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ 'تعمیر نہ کر !

تعمیر سیرت میں صلوٰۃ کی اہمیت

اسلام اور قرآن حکیم انسان کے سامنے جو اعلیٰ نصب العین پیش کرتے ہیں' اس کے حصول کے لیے جو جدوجہد درکار ہے اس کے لیے پہلے پختہ انسانی شخصیتیں ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان پختہ شخصیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے جو پروگرام اور لائحۂ عمل قرآن مجید تجویز کرتا ہے اس کا اوّل و آخر صلوٰۃ ہے۔

ہم نے قرآن حکیم کے ان دو مقامات پر دیکھا کہ آغاز میں بھی نماز کا ذکر ہے اور اختتام پر بھی نماز ہی کا ذکر ہے۔ میں اس بات کو نبی اکرم ﷺ کی دو احادیث سے واضح کروں گا کہ

اسلام کا نقطۂ آغاز نماز ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ)) (۱)

''شرک و کفر اور بندے کے درمیان نماز ترک کرنے کا معاملہ حائل ہے۔''

یعنی اسلام اور کفر کے مابین امتیاز نماز ہی سے قائم ہوتا ہے۔ پھر دیکھئے کسی عمارت کی درمیانی اور اہم شے اُس کا عمود ہوتی ہے جس پر چھت کھڑی ہوتی ہے' جسے ہم ستون کے نام سے جانتے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ)) (۲) ''نماز دین کا ستون ہے''۔ پھر یہ کہ دین کی اس بلند ترین حقیقت کے بارے میں صوفیاء کا مشہور قول ہے: ''اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ'' یعنی صلوٰۃ مؤمنین کے لیے معراج کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ ابتدا بھی' اہم اور درمیانی عمود بھی اور چوٹی بھی' ان تمام مرحلوں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ نماز دین کی اہم ترین شے ہے ۔ میں اسے یوں تعبیر کروں گا کہ اگر ہم انسان کی سیرت سازی کو ایک شہر سے تشبیہہ دیں تو اس کے گرداگرد جو فصیل کھینچی ہوئی ہے وہ نماز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی اگر دیکھا جائے تو نماز کو اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں قائم کرلے تو اس کی زندگی گویا ایک حصار میں آجاتی ہے' ایک کھونٹے سے بندھ جاتی ہے۔ پھر اس کے سارے پروگرام اس نماز کے حوالے سے طے ہوں گے' اس کی appointments اگر ہوں گی تو نماز کے اوقات کو مدنظر رکھ کر ہوں گی' اس کے شب و روز کے معمولات میں فیصلہ کن چیز نماز ہوگی ۔ لہٰذا پوری انسانی زندگی کو شکنجے میں کس لینے والی شے نماز ہے۔

''صلوٰۃ'' کا مفہوم

آیئے پہلے ہم یہ سمجھیں کہ ''صلوٰۃ'' جو قرآن مجید کا اصل لفظ ہے اور ''نماز'' جو فارسی کا لفظ ہے' ان دونوں کے مفاہیم میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں اسلام جب پہنچا ہے تو فارسی زبان کے حوالے سے پہنچا ہے' لہٰذا اکثر

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ۔

(۲) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ راوی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

اصطلاحاتِ قرآنیہ کا ترجمہ جو اردو میں مستعمل ہے وہ فارسی الاصل ہے۔ فارسی زبان میں ان الفاظ کا ایک اپنا مفہوم پہلے سے تھا۔ وہ مفہوم کہیں غیر شعوری طور پر ان اصطلاحات کے اصل مفہوم میں شامل نہیں ہو جانا چاہیے جو قرآن کریم اور ہمارے دین سے مراد ہے۔ عربی زبان میں "ص ل ی" کا مادہ (root) جس سے یہ لفظ صلوٰۃ بنا ہے' اپنے اندر دو بنیادی مفہوم رکھتا ہے۔ ایک ہے : "اِقدام الی الشئ" کہ کسی کی طرف بڑھنا' کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا۔ گویا صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے اور متوجہ ہونے کا نام ہے' اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا نام ہے۔ یہ چونکہ مکالمہ و مخاطبۂ الٰہی سے مشرف کرنے والی چیز ہے لہٰذا یہ حقیقی ایمان کے لیے بمنزلہ ''معراج'' ہے۔

یہی لفظ ''صلوٰۃ'' دعا کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی سے دعا کرتا ہے تو وہ اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوتا ہے۔یہی لفظ عنایت و شفقت کے مفہوم میں بھی آتا ہے' جیسے سورۃ الاحزاب میں وارد ہوا ہے :

{اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ} (آیت ۵۶)

''بے شک اللہ صلوٰۃ بھیجتا ہے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور اس کے فرشتے بھی''۔ اسی سورت میں ایک اور جگہ آیا ہے :

{ہُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ} (آیت ۴۳)

''(اے اہلِ ایمان ! اپنے نصیب پر فخر کرو کہ) وہ (اللہ) تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے اور اُس کے فرشتے بھی''۔ اس سے مراد کیا ہے؟ صلوٰۃ اگر اللہ کی طرف منسوب ہو تو اس کا مفہوم ہو گا اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے عنایت' شفقت' رحمت ' توجہ۔ فرشتوں کی طرف منسوب ہو کر اس کا مفہوم ہو جائے گا اُن کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین صادقین کے لیے اللہ کی شفقت' عنایت' رحمت اور توجہ کے لیے اُس کے حضور میں دعا۔ تو یہ سب باتیں اس لفظ صلوٰۃ کے پہلے بنیادی مفہوم میں شامل ہیں۔

آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہوگا کہ صلوٰۃ کے آغاز کے لیے حدیث میں سورۃ الانعام کے یہ الفاظِ مبارکہ بھی آتے ہیں:

{اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۷۹﴾ }

''میں نے اپنی توجہ کو مرتکز کر لیا ہے اُس ذات کی طرف (اُس ہستی کی جانب) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا

(اور میں ہر شے سے اپنی توجہ کو ہٹا کر اور) یکسو ہو کر (اللہ تعالیٰ کی جناب میں متوجہ ہو رہا ہوں) اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں''۔ یہ صلوٰۃ کا نقطۂ آغاز ہے۔

صلوٰۃ کا یہ جو مفہوم ہے اس کے اعتبار سے یہ بات ذہن میں رکھیے کہ صلوٰۃ یا نماز کا مقصد ذکرِ الٰہی بنتا

ہے۔ صلوٰۃ میں آپ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' اللہ عزوجل آپ کو یاد آتا ہے۔ اسی لیے سورہ طٰہٰ میں فرمایا:

{اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾} ''نماز کو قائم کرو' صلوٰۃ کو قائم رکھو میری یاد کے لیے''۔

اسی لفظ کا دوسرا بنیادی مفہوم ہے: ''آگ سے حرارت حاصل کرنا' تاپنا''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا تھا:

{اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ اَوۡ اٰتِیۡکُمۡ بِشِہَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۷﴾} (النمل)

''میں نے آگ دیکھی ہے' میں اس سے عنقریب کوئی خبر لاؤں گا یا کوئی انگارا لاؤں گا تاکہ تم (سردی سے بچنے کے لیے) تاپ سکو''۔ اس مفہوم کو بھی مدنظر رکھیے۔ اس کے حوالے سے حقیقتِ صلوٰۃ کا یہ پہلو سامنے آنا چاہیے کہ انسان کی روح میں اگر ضعف و اضمحلال پیدا ہو گیا ہو' اس پر افسردگی طاری ہو گئی ہو' تو اس میں حرارتِ تازہ پیدا کرنے کا ذریعہ صلوٰۃ ہے۔ جذباتِ ایمانی کے متعلق اگر محسوس ہو کہ ان پر کچھ ٹھنڈ طاری ہے یا اَوس پڑ گئی ہے تو ان جذبات کے اندر از سرِ نو ایک حرارتِ ایمانی کا پیدا کرنا صلوٰۃ کا مقصد ہے۔ ان دونوں بنیادی مفاہیم اور ان کے ذیلی مفاہیم کو ذہن میں رکھیے تو صلوٰۃ کا جو اصل مطلوب و مقصود ہے' اس کی جو اصل حکمت اور اصل غرض و غایت ہے' وہ سامنے آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے توجہ دلائی ہے کہ اگر یہ باطنی کیفیات موجود نہ ہوں تو پھر نماز محض ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے' اس میں رکوع و سجود تو ہوتا ہے لیکن توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہی نہیں۔ وہ ایک جسمانی مشقت تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا جو اصل حاصل ہے اس تک انسان کی رسائی نہیں ہوتی۔ علامہ کہتے ہیں: ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب' میرا سجود بھی حجاب!

اور: ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

توجہ اور انابت الی اللہ کے بغیر فرض عبادات محض رسومات بن کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی ادائیگی کی حیثیت رسم پرستی کی رہ جاتی ہے اور جو اصل حقائق و مقاصد ہیں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جیسے علامہ نے کہا ہے: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

البتہ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اس کیفیت میں بھی یہ نماز فائدے سے بالکل خالی نہیں ہے۔ ایک شخص نے اگر وقت صرف کیا ہے' وہ اپنے کاروبار اور مشغولیات سے نکلا ہے' اس نے وضو کیا ہے' پھر وہ نیت باندھ کر اللہ کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے' تو اس نے جو جسمانی مشقت جھیلی ہے آخر اس کا اجر و ثواب تو اسے ملنا چاہیے۔ یہی وقت وہ کاروبار میں لگاتا' یا زندگی کی کسی اور مصروفیت و مشغولیت میں صرف کرتا تو اس سے وہ کوئی منفعت حاصل کرتا۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا کوئی اجر و ثواب نہ ہو۔ اجر و ثواب تو ملے گا۔ فرض کی ادائیگی فی نفسہٖ بہت بڑی بات ہے کہ اُس نے اللہ کے ایک حکم پر عمل کیا ہے' امتثالِ امر بجا لایا ہے' لیکن نماز کے جو اصل مقاصد ہیں وہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ توجہ' انابت' خشوع و خضوع اور وہ حضوری ٔقلب کی کیفیت نہ ہو جو مطلوب ہے۔ علامہ اقبال اس کے متعلق جذبات سے مغلوب ہو کر کہتے ہیں : ؎

تیرا امام بے حضور' تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر' ایسے امام سے گزر

صلوٰۃ کا ظاہری نظام

اس صلوٰۃ کا ایک ظاہری نظام ہے۔ اس کی معین ہیئات ہیں' حرکات و سکنات ہیں۔ اس میں تکبیرِ تحریمہ ہے' ہاتھوں کا اٹھانا ہے' اس میں قیام اور رکوع ہے' پھر قومہ ہے'

پھر سجدہ ہے' پھر جلسہ ہے' پھر دوسرا سجدہ ہے۔ اس طرح ایک رکعت کی تکمیل ہوتی ہے ۔ اس کے مقررہ اوقات ہیں' ازروئے الفاظِ قرآنی :
{اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾}(النساء)

پھر اس میں تعدادِ رکعات کی تعیین ہے۔ مزید برآں نماز باجماعت کا نظام ہے۔ یہ پورا صلوٰۃ کا نظامِ ظاہری ہے۔ اس کے بارے میں اوّلاً تو یہ اصل الاصول ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ سارے کا سارا منقول ہے' ماثور ہے' مسنون ہے محمد' رسول اللہ ﷺ سے۔ اس کی اصل بنیاد میرا' آپ کا یا کسی اور کا اجتہاد نہیں ہے۔ شخصی اجتہاد

پر معاملہ لے آئیں گے تو سب کی نماز علیحدہ علیحدہ ہو جائے گی' یکسانی اور یک رنگی نہیں رہے گی۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) (۱) ''صلوٰۃ ایسے ادا کرو (نماز ایسے پڑھو) جیسے مجھے دیکھتے ہو کہ میں پڑھتا ہوں''۔

اس صلوٰۃ کے ظاہری نظام کے بارے میں یہ بات بھی جان لیجیے کہ اس میں ہمیں عجیب حکمت یہ نظر آتی ہے کہ اس کے ذریعے سے اسلامی معاشرے میں اجتماعی سطح پر تطہیر و تنظیم کا ایک نہایت اعلیٰ نظام قائم کیا گیا ہے۔ اجتماعی طور پر نماز ادا ہو رہی ہے' ہر روز ایک ہی وقت میں دن میں پانچ مرتبہ مسلمان مساجد میں جمع ہو رہے ہیں۔ اجتماعی ماحول اس کے لیے جزوِ لازم بن گیا ہے۔ پھر اس میں تنظیم کا معاملہ مستقل طور پر ہو رہا ہے۔ محلہ' وار تنظیم بھی ہے۔ جمعہ کے دن اس سے بھی بڑی تنظیم ہے۔ عیدین کے موقع پر بڑے بڑے شہروں میں تنظیم ہے۔ حج کے موقع پر پورے کرۂ ارضی سے وہ لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں جو توحید کے ماننے والے ہیں اور جو محمد رسول اللہ ﷺ کے کلمہ گو ہیں۔ اس طرح مسلمانانِ عالم کا عالمی اجتماع اور عالمی تنظیم کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس نظامِ صلوٰۃ میں اجتماعی تطہیر و تنظیم بھی پیشِ نظر ہے۔

نظامِ صلوٰۃ میں محافظت و مداومت کی اہمیت

نظامِ صلوٰۃ کے متعلق یہ بات جان لیجیے کہ اس میں اہم ترین چیز محافظت اور مداومت ہے۔ اس نظام کو مستقل قائم و دائم رکھنا ہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہا نماز ادا کر لی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ والاقامۃ وکذالک

اور جب چاہا گول کر دی' یا جب جی چاہا نماز تو پڑھ لی لیکن اوقات کی پابندی نہیں کی گئی' یا بلا کسی عذر اور مجبوری کے گھر میں ہی ادا کر لی' مسجد میں حاضر نہیں ہوئے۔ تو یہ طرزِ عمل اقامتِ صلوٰۃ کے تقاضوں کے منافی ہے' اس طرح اس کی اجتماعی مصلحتیں اور حکمتیں بالکل ضائع ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس کے لیے ''محافظت'' اور ''مداومت'' لازمی ہے۔ میں نے یہ دونوں الفاظ اسی سبق سے لیے ہیں۔ سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج میں صلوٰۃ کے لیے جو آخری بات آئی ہے وہ محافظت ہے۔ سورۃ المؤمنون میں فرمایا: {وَ الَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَوٰتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ ۹} اور سورۃ المعارج میں فرمایا: {وَ الَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ ۳۴} یعنی وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں' اس کا پورا اہتمام کرتے ہیں' اس کے تمام قواعد و ضوابط اور اس کے تمام آداب کی پابندی ملحوظ رکھتے ہیں۔ نیز سورۃ المعارج میں فرمایا: {الَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ ۲۳} ''وہ لوگ جو اپنی نمازوں میں مداومت (یعنی ہمیشگی اور پابندی) کرتے ہیں''۔ لہٰذا صلوٰۃ کے نظامِ ظاہری کے ساتھ اقامت' محافظت اور مداومت' ان تین الفاظ کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیجیے۔

صلوٰۃ کی روحِ باطنی

آگے چلیے۔ صلوٰۃ کی ایک روحِ باطنی ہے۔اس کے لیے لفظ ”خشوع“ آیا ہے: {قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾} ’’فلاح سے ہمکنار ہوئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں‘‘۔ یہاں خشوع سے اصلاً مراد ہے انسان کی معنوی شخصیت کا اپنے ربّ کے حضور میں جھک جانا۔ ظاہری طور پر تو جسم جھک ہی رہا ہے۔ آپ کھڑے ہوتے ہیں تو اس انداز سے جس میں جھکاؤ ہوتا ہے‘ سینہ تان کر کھڑے نہیں ہوتے۔ پھر رکوع کرتے ہیں تو مزید جھکاؤ ہو گیا ہے۔ پھر جب سجدے میں گئے تو جھکاؤ کی انتہا ہو گئی۔ لیکن اگر صرف ظاہری طور پر جسم جھک رہا ہو‘ اور جو معنوی شخصیت ہے اور اندر کا انسان ہے اگر اس کی گردن اکڑی ہوئی ہو‘ وہ اللہ کے سامنے معنوی طو رپر سرنگوں اور surrender نہ ہو رہا ہو‘ انسان کا نفس امارہ سرکشی اور

تمرد پر تلا ہوا ہو‘ وہ اللہ کے سامنے نہ جھک رہا ہو تو ظاہری نماز تو ادا ہو گئی‘ لیکن جو حقیقی نماز ہے وہ ادا نہیں ہو گی۔ اسی لیے اس سبق میں خشوع کی طرف بھی توجہ دلادی گئی۔

خشوع و خضوع اور حضورِ قلب وہ باطنی کیفیات ہیں جو مطلوب ہیں‘ اور اقامت‘ محافظت اور مداومت یہ وہ چیزیں ہیں جو نظامِ صلوٰۃ کے ظاہر کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس ظاہر کے ساتھ اسلامی معاشرے کی اجتماعی مصلحتیں وابستہ ہیں اور اس باطنی کیفیات کے ساتھ ایک بندۂ مؤمن کی اپنی ذاتی سیرت و کردار کی تعمیر اور اس کے ترفع کا مسئلہ متعلق و وابستہ ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے نماز سے وہ اصل اور حقیقی برکات ظاہر ہوتی ہیں جن کا ذکر سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۵ کے درمیان میں فرمایا گیا ہے:

{اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ}

’’بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بری بات سے‘ اور یقینا اللہ کی یاد ہی سب سے بڑی (اعلیٰ اور ارفع) بات ہے‘‘۔

لیکن اگر اس کے برعکس معاملہ ہو گا تو صلوٰۃ کی ادائیگی کے باوجود معاشرہ ان برکات سے محروم رہے گا۔

صلوٰۃ کی پابندی: ایمان کا تقاضا

ایک بات اور جان لیجیے کہ نمازوں میں ایک تو فرض نمازیں ہیں اور بقیہ نوافل و سنن ہیں۔فرض نمازیں تو لازم ہیں‘ ان کو ہر صورت میں ادا کرنا ہے۔ البتہ ان کی ادائیگی کے لیے خود شریعت ہی نے چند رعایتیں دے رکھی ہیں۔ مثلاً کوئی عذر ہے تو آپ مسجد میں نہ جائیں‘ نماز گھر میں ادا کر لیں۔ فرض کیجیے آپ بیمار ہیں تو گھر میں پڑھ لیں‘ قیام کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر پڑھ لیں۔ اس سے بھی زیادہ معذور ہیں تو لیٹ کر پڑھ لیں‘ جس میں قیام‘

رکوع‘ قومہ‘ سجدہ‘ جلسہ اور قاعدہ کے لیے اشارات کفایت کریں گے۔ ایسی رعایتیں خود شریعت نے فراہم کر دی ہیں۔ لیکن جہاں تک فرض نماز کا قصداً ضائع کر دینا ہے تو اس کے بارے میں جان لیجیے کہ یہ گویا حقیقی و قلبی ایمان کا ضائع کر دینا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم نے سورۃ المعارج میں دیکھا کہ وہاں اُس مقام پر لفظ ’’الْمُصَلِّیْنَ‘‘ لایا گیا ہے جس مقام پر سورۃ المؤمنون میں ’’الْمُؤْمِنُوْنَ‘‘ کا لفظ آیا ہے: {قَدْ اَفْلَحَ

الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿ ۱ ﴾ الَّذِیْنَ ہُمْ فِیْ صَلَاتِہِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿ ۲ ﴾} اور سورۃ المعارج میں فرمایا: {اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾} بہرحال اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ تعمیرِ سیرتِ انسانی کے قرآنی پروگرام کا مرکز و محور‘ اس کا نقطۂ آغاز اور اس کی آخری منزل‘ یہ سب صلوٰۃ پر مبنی ہیں۔

انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے ضمن میں جو اساسی پروگرام قرآن حکیم ہمیں دیتا ہے‘ اس کے جزوِ اوّل کے بارے میں‘ جو اس لائحۂ عمل کا اہم ترین جزو ہے‘ ہم نے سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں یہ دیکھا کہ دونوں جگہ کامل مطابقت ہے‘ کہ دونوں مقامات پر اوّلاً بھی صلوٰۃ کا ذکر آیا اور اختتام بھی صلوٰۃ پر ہوا۔ پھر یہ کہ دونوں مقامات پر صلوٰۃ کی محافظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سورۃ المؤمنون میں خشوع و خضوع کی طرف توجہ دلائی گئی اور سورۃ المعارج میں مداومت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کو جمع کر لیا جائے تو اس سے اقامت صلوٰۃ کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ ہم بعد کی سورتوں میں قرآن حکیم میں اسی اصطلاح کو دیکھتے ہیں‘ مثلاً: {اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ} اور {وَالَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ}۔

اس پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء (اعراض عن اللغو اور زکوٰۃ) کے ضمن میں ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں جن کا دونوں سورتوں میں تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان میں ایک تو ترتیب عکسی ہے‘ یعنی سورۃ المومنون میں پہلے اعراض عن اللغو کا ذکر ہے اور بعد میں زکوٰۃ اور تزکیہ کا‘ جبکہ سورۃ المعارج میں پہلے زکوٰۃ اور تزکیہ کا ذکر ہے اور پھر ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالقیامہ کا‘ جس کا اعراض عن اللغو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان دونوں اوصاف کے بیان میں دونوں مقامات پر تعبیر کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ قدرے مختلف ہیں اور ان سے ہمیں ان دونوں کی اصل حقیقت اور اصل روح کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

لغو کاموں سے پرہیز

ہم اِس وقت سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی ترتیب کے مطابق گفتگو کریں

گے۔ اس میں مُفْلِحِین کا جو دوسرا وصف آیا ہے وہ "اِعراض عَنِ اللَّغو" ہے۔ لغو کا مفہوم معصیت یا گناہ نہیں ہے ‘بلکہ وہ کام مراد ہے جو خواہ فی نفسہٖ مباح ہو‘ اس کی شریعت میں ممانعت نہ ہو‘ لیکن انسان کو اس کا کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔قرآن مجید انسان کے وقت کی قدر و قیمت کے معاملہ پر بہت زور دیتا ہے اور اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے کہ یہی انسان کا اصل سرمایہ اور رأس المال ہے۔ اس ''وقت'' ہی سے انسان کو بنانا ہے جو کچھ بھی بنانا ہے اور اس ''وقت'' ہی میں بننا ہے جو کچھ بھی بننا ہے۔ لہٰذا اس وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہیے۔ یہ وقت یا تو کسی حقیقی دُنیوی ضرورت کو پورا کرنے میں صرف ہو‘ یا اس کے ذریعے سے آخرت کے لیے کوئی کمائی کی جائے۔ ہر وہ کام جس سے نہ تو کوئی دُنیوی ضرورت حاصل ہو رہی ہو اور نہ اس کے ذریعے انسان آخرت کے لیے کوئی کمائی کر رہا ہو تو ایسا کام "لغو" شمار ہو گا ‘ خواہ وہ ممنوعات کی فہرست میں شامل نہ ہو‘ وہ حرام و ناجائز نہ ہو‘ وہ معصیت اور گناہ نہ ہو۔ اس حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے بایں الفاظ بیان فرمایا:

((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ)) (۱)

یعنی انسان کے دین اور اسلام کے حسن و خوبی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو ترک کر دے جو لایعنی ہو‘ جس کا اسے کوئی فائدہ نہ پہنچ رہا ہو۔ تو ہر لایعنی اور غیر مفید کام کو چھوڑ دینا "اعراض عن اللغو" ہے۔

اب آپ غور کیجیے کہ اصل میں اس کا گہرا تعلق ہمارے تصوّرِ حیات سے ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا کی زندگی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ بس یہی کل زندگی ہے‘ کوئی بعث بعد الموت اور آخرت نہیں‘ کوئی جزا و سزا نہیں‘ پھر تو ظاہر بات ہے کہ اپنی معاشی ضروریات سے جو وقت بھی بچ رہا ہو گا وہ اس کا کوئی مصرف تلاش کرے گا کہ کوئی hobby اور مشغلہ ہو‘کوئی amusement اور تفریح ہو‘ وقت گزاری کے لیے (to pass time) کوئی شغل ہو۔ لیکن اُس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے جسے اس بات کا یقین ہے

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الزھد عن رسول اللہ ﷺ‘ باب فیمن تکلم بکلمۃ یضحک بھا الناس۔وسنن ابن ماجہ‘ کتاب الفتن‘ باب کف اللسان فی الفتنۃ۔

کہ دراصل اس دنیا کی زندگی تو ایک دیباچہ اور مقدمہ ہے‘ اصل کتابِ زندگی تو موت کے بعد کھلے گی : { وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَہِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ } (العنکبوت) ''اصل گھر تو آخرت کا گھر ہے(زندگی تو آخرت کی زندگی ہے)‘ کاش انہیں معلوم ہوتا !'' ---- ایک بڑی پیاری حدیث ہے جس میں اُس نتیجے کا بیان ہے جو اس حقیقت کے انکشاف سے برآمد ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْآخِرَۃِ)) (۱) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا کے بارے میں یہ حقیقت منکشف ہونے کے بعد اب اس دنیا کی زندگی کا

ایک ایک لمحہ قیمتی ہو گیا۔ ہمیں اس میں بونا ہے تاکہ اسے ہم آخرت میں کاٹ سکیں۔ لہٰذا جس کے دل میں یہ ایمان بالآخرۃ ہو گا وہ اپنے وقت کی جس طرح قدر و قیمت کا احساس کرے گا ایسا اُس شخص کا معاملہ نہیں ہو سکتا جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔

سورۃ العصر جہاں سے ہمارے اس سلسلۂ درس کا آغاز ہوا' اس میں ہم نے جو پہلا لفظ پڑھا وہ ہے : {وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾} ''زمانہ کی قسم ہے''۔ یہ زمانہ تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔ یہی تمہارا رأس المال ہے۔ اس کے بارے میں ایک مفسر نے بڑی عبرت انگیز مثال پیش کی ہے کہ برف کا ایک تاجر چلاتا ہے کہ لوگو ! رحم کرو ! اگر میرا یہ برف فروخت نہ ہوا تو میرا جو رأس المال ہے وہ پگھل جائے گا۔ میں یہ بات ہنری ورڈز ورتھ کی ایک نظم '' Psalm of Life'' کے حوالے سے بیان کیا کرتا ہوں جس میں شاعر نے اس حقیقت کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے :

Art is long and time is fleeting

And our hearts though stout and brave

Still, like muffled drums are beating

Funeral marches to the grave.

اِس وقت کی قدر کرو' یہ بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ اور جس طرح کسی اہم فوجی شخصیت کا

---

(۱) یہ حدیث حافظ زین الدین العراقی نے تخریج الاحیاء (۴/۲۴) میں اور ابوالخیر السخاوی نے المقاصد الحسنۃ (۲۴۰) میں نقل کی ہے۔ ملا علی قاری نے اسے الاسرار المرفوعۃ (۲۰۶) میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے : ''قیل لا أصل لہ أو بأصلہ موضوع''۔

جنازہ ڈھول کی ہر ضرب کے ساتھ قبر سے نزدیک تر ہوتا جاتا ہے اسی طرح ہمارے دل کی ہر دھڑکن گویا ہمیں ہماری قبر سے قریب تر کر رہی ہے۔

یہ احساس اگر سامنے ہو تو معلوم ہوگا کہ وقت کی کیا قدر و قیمت ہے ! لہٰذا یہاں تعمیر سیرت کے ذیل میں جو دوسرا وصف بیان ہوا وہ ہے ''اِعراض عن اللّغو'' اور اس پر سورۃ المعارج کے ان الفاظ سے روشنی پڑی : {وَ الَّذِیۡنَ یُصَدِّقُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۲۶﴾} ''وہ لوگ جو روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں''۔ قیامت کے دن کو مانتے ہیں : {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّہِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۷﴾} ''اور وہ لوگ جو اپنے ربّ کے عذاب (کے خیال) سے لرزاں

وترساں رہتے ہیں‘‘۔ اور واقعہ یہ ہے کہ : {اِنَّ عَذَابَ رَبِّہِمۡ غَیۡرُ مَاۡمُوۡنٍ ﴿۲۸﴾} ’’بے شک ان کے ربّ کا عذاب چیز ہی ایسی ہے جس سے بے خوف (اور نچنت) ہوا ہی نہیں جا سکتا۔‘‘

زکوٰۃ پر کاربند رہنا

تیسرا وصف سورۃ المومنون میں یہ بیان ہوا : {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾} ’’اور وہ لوگ جو زکوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں‘‘۔ میں نے پہلے بھی توجہ دلائی تھی کہ جب قرآن مجید میں زکوٰۃ کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ فعل اِیۡتَاء آتا ہے‘ مثلاً اِیۡتَایِ الزَّکٰوۃِ‘ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ‘ اٰتَی الزَّکٰوۃَ‘ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۔ لیکن یہاں اسلوب مختلف ہے۔ یہاں فرمایا گیا : {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾} ۔ اس میں ایک تو دراصل زکوٰۃ کی بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی اور دوسرے یہ کہ فٰعِلُوۡنَ فرما کر اس بات کو واضح کیا گیا کہ وہ لوگ یہ عمل مسلسل کرتے رہتے ہیں۔

یہاں اس بات کو جان لیجیے کہ زکوٰۃ کا اصل مفہوم اور اس کی بنیادی حقیقت کیا ہے ! جیسے ’’ف ل ح‘‘ کے مادے سے ہم نے فلح کا مفہوم سمجھا تھا ایسے ہی ’’ز ک ی‘‘ کے حوالے سے ہمیں اس کا اصل مفہوم سمجھنا ہو گا۔ اسے آپ ایک مالی کے عمل پر قیاس کر کے بخوبی سمجھ سکیں گے جس نے ایک باغیچہ لگایا ہے‘ جس میں کچھ پودے اُس نے خود لگائے ہیں جو پھل دار ہیں‘ یا پھول دار ہیں۔ لیکن اسی باغیچے میں خودرَو گھاس اور کچھ جھاڑ جھنکاڑ

بھی اپنے آپ اُگ آتا ہے اور یہ خودرَو گھاس یا جھاڑ جھنکاڑ اِن پودوں کی نشوونما میں رکاوٹ بنتا ہے۔ زمین میں جتنی قوتِ نمو ہے اسے اگر یہ خودرَو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ نہ کھینچ رہے ہوں تو یہ ساری قوتِ نمو اُن پودوں کو ملے گی جو اس مالی نے خود لگائے ہیں‘ ورنہ یہ گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ بھی اس میں سے اپنا حصہ وصول کریں گے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہ خودرَو چیزیں ان پودوں کے لیے ہوا کی آکسیجن اور سورج کی تمازت حاصل کرنے سے رکاوٹ بن رہی ہوں۔ لہٰذا مالی اپنے کھرپے کے ذریعے سے‘ جو ہر وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے‘ اس باغیچے کے اندر سے تمام خودرَو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کو علیحدہ کر دے گا۔ مالی کا یہ عمل ’’تزکیہ‘‘ ہے۔ چنانچہ تزکیہ کا اصل مفہوم یہ ہوا کہ کسی شے کی نشوونما میں جو رکاوٹ ہو اس کو دور کر دینا ۔

اب اس بات کو جان لیجیے کہ ہر انسان‘ ہر فردِ نوعِ بشر اللہ تعالیٰ کی کیاری کا ایک پودا ہے جو اُس نے لگایا ہے۔ چنانچہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ پروان چڑھے‘ پھلے پھولے‘ اس میں جو استعدادات اللہ نے ودیعت کی ہیں وہ پورے طور پر بروئے کار آئیں اور نشوونما پائیں۔ اس طرح انسان اپنے اس اصل مقام کو حاصل کر لے جس کے لیے اللہ نے اسے بالقوۃ (potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اس کی اس نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ’’ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں‘‘ کے مصداق ان تمام چیزوں کو جمع کریں گے تو وہ ہے دنیا کی محبت۔

چنانچہ آپ قرآن مجید میں بار بار دیکھیں گے کہ جہاں انسان کی گمراہی اور بے راہ روی کے اصل سبب کی تشخیص ہوتی ہے وہاں عموماً یہ بات آئے گی:

{بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿۱۶﴾ وَ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ﴿۱۷﴾} (الاعلیٰ)

''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی''۔ کہیں فرمایا جاتا ہے:

{کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ ﴿۲۰﴾ وَ تَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ ﴿۲۱﴾} (القیامۃ)

''ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم عاجلہ (دنیا کی زندگی) سے محبت کرتے ہو' اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو''۔ ہم سورۃ القیامۃ کے درس میں ان آیات کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تمہارے دل حب عاجلہ میں گرفتار ہو گئے ہیں

اور تم آخرت کو نظر انداز کرتے ہو۔ اور عاجلہ سے مراد یہ دنیا ہے۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے آیئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حب دُنیا کا سب سے بڑا نشان' اس کی سب سے بڑی علامت (symbol) حب مال ہے۔ سورۃ الفجر میں فرمایا: {وَّ تُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾} ''اور تم مال سے محبت کرتے ہو جی بھر کر''۔ تم پر اسے جمع کرنے کی دُھن سوار رہتی ہے۔ اور سورۃ الھمزۃ میں فرمایا:

{الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۚ﴿۳﴾} ''(تباہی ہے اُس شخص کے لیے) جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشے گا''۔ پس یہ مال کی محبت ہی انسان کے اخلاقی ارتقاء اور اس کی اعلیٰ اقدار کی نشوونما میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس رُخ پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کی شخصیت ترقی اور نشوونما پائے' اس کا ارتقاء ہو' اس کی تعمیر ہو' اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی مال کی محبت ہے۔ لہٰذا اس مال کی محبت کو دل سے کھرچنے کے لیے نسخہ انفاقِ مال ہے' یعنی مال کا اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لیے خرچ کرنا۔ وہ خیرات و صدقات کی صورت میں محتاجوں' مسکینوں' یتیموں' بیواؤں کی مدد میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ قرابت داروں کا حق ادا کرنے میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ پیغامِ الٰہی کی نشر و اشاعت کے لیے صرف ہو رہا ہو۔ وہ دین کی سربلندی اور غلبہ کے لیے اور اس کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے صرف ہو رہا ہو۔ یہ ہے اصل میں ''عملِ تزکیہ''۔ یہ کرتے رہو گے تو دل سے مال کی محبت ختم ہو گی' جو اصلاً علامت ہے حب دنیا کی۔ اور حب دنیا کا یہ بریک (brake) اگر کھل گیا' اس کی گرفت ختم ہو گئی تو اب تمہاری گاڑی پوری رفتار کے ساتھ اس شاہراہ پر چلے گی جس پر چل کر تم تعمیرِ ذات' تعمیرِ خودی' تعمیرِ شخصیت اور تعمیر سیرت و کردار کے باب میں ترقی کر سکو گے۔

اب اس ارتقاء و ترقی کے لیے قرآن مجید نے ایک دوگونہ پروگرام بتایا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ صلوٰۃ میں وہ نماز بھی شامل ہے جو فرض ہے‘جس کو آپ نے ہر حالت میں ادا کرنا ہے‘ جس کے لیے روزانہ پانچ فرض نمازوں کا نظام موجود ہے‘ اور

اس کے ساتھ ہی نفل نمازیں بھی صلوٰۃ کے زمرے میں شامل ہیں‘اسی طرح اس زکوٰۃ کے عمل کے بھی دو اجزاء کر دیے گئے۔ ایک ’’زکوٰۃ‘‘ تو لازم اور فرض ہو گئی اور اس کے لیے ایک خاص حد معین کر دی گئی ہے جسے ’’نصاب‘‘ کہا جاتا ہے۔ یعنی مالی حیثیت سے اس سے زائد جو بھی ہے اس پر شرحِ نصاب کے مطابق لازماً رقم لے لی جائے گی ۔ اس کی ادائیگی فرض ہے۔ اس کو اصطلاحاً زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔
لیکن عمل تزکیہ تو دائم ہے۔ اس میں صرف زکوٰۃ مفروضہ ہی نہیں‘ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مزید انفاقِ مال کی ترغیب ہے۔ جیسے ہم آیۂ بر میں پڑھ چکے ہیں:
{وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَ السَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ} (البقرۃ:۱۷۷)

یہاں فرض زکوٰۃ کا علیحدہ سے ذکر ہے اور اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ ’’اُس نے مال محبوب ہونے کے باوجود اسے قرابت داروں‘ یتیموں‘ مساکین‘ سوال کرنے والوں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کیا‘‘۔ لہٰذا مطلوب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اور دو‘ بڑھ چڑھ کر دو۔ اس کی جب آخری حد پوچھی گئی کہ حضور! کہاں تک دیں؟ تو قرآن مجید میں اس کی وضاحت فرمائی گئی:
{یَسْـَٔلُوْنَکَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ} (البقرۃ:۲۱۹)
’’یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ تو (اے نبیؐ!) ان سے کہیے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے (اسے دے ڈالو)‘‘۔ پھر مزید تشویق و ترغیب کے لیے فرمایا:
{لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ ؕ} (آل عمران:۹۲)
’’تم نیکی (کے بلند ترین مقام) تک نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ (اللہ کی راہ میں) اس چیز میں سے صرف نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے‘‘۔ اب یہ ہے وہ عملِ تزکیہ جس کی ترغیب و تاکید قرآن مجید میں بار بار آتی ہے۔ آخری پارے کی سورۃ الشمس میں نفسِ انسانی کے بارے میں فرمایا گیا:
{وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىہَا ۙ﴿۷﴾ فَاَلْہَمَہَا فُجُوْرَہَا وَ تَقْوٰىہَا ۙ﴿۸﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰىہَا ۙ﴿۹﴾} ’’گواہ ہے یہ نفسِ انسانی اور جو اللہ نے اسے بنایا اور سنوارا (اور اس میں طرح طرح کی صلاحیتیں اور بہت سی استعدادات ودیعت فرمائیں)۔ پھر اس

میں بدی اور نیکی کا شعور بھی الہامی طور پر پیدا فرمادیا۔ تو جس کسی نے اس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک آلود کر دیا وہ ناکام و نامراد ہوا''۔ یہی بات ہم سورۃ الاعلیٰ میں دیکھتے ہیں :{قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ﴿۱۴﴾ وَ ذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ﴿۱۵﴾} ''کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کر لیا اور اس نے اپنے ربّ کے نام کا ذکر کیا اور نماز ادا کی''۔ سورۃ الاعلیٰ کی یہ دو آیتیں سورۃ المؤمنون کی ان آیات سے بہت مشابہ ہیں:
{قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾}

تو یہ تھے تعمیرِ سیرت کے قرآنی پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء' یعنی ایک ''اِعراض عَنِ اللَّغو'' جس کا براہِ راست تعلق ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالقیامۃ سے ہے' اور دوسرے تزکیہ پر مسلسل عمل پیرا رہنا۔ اسی کے لیے سورۃ المعارج میں یہ الفاظ آئے:
{وَ الَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۲۵﴾} ''اور وہ لوگ کہ جن کے اموال میں حق ہے' جو جانا پہچانا ہے' سائل کے لیے بھی اور محروم کے لیے بھی۔''

جنسی جذبہ پر قابو رکھنا

اب ہم سورۃ المومنون کی آیات ۵ تا ۷ پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ یہ تینوں آیات بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۃ المعارج (آیات ۲۹ تا ۳۱) میں بھی وارد ہوئی ہیں:
{وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِفُرُوۡجِہِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَاِنَّہُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡعٰدُوۡنَ ۚ﴿۷﴾}
''اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں یا باندیوں کے' پس (ان کے معاملہ میں) ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے۔''

تعمیر سیرت کے جس قرآنی پروگرام کا ہم سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ کے حوالہ سے مطالعہ کر رہے ہیں اس میں چوتھا

وصف یا اس کا چوتھا جزو جنسی جذبہ پر قابو رکھنا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انسان میں جو مختلف قسم کے حیوانی میلانات اور داعیات ہیں ان میں سے ایک اہم میلان جنسی جذبہ بھی ہے۔ انسان کا پیٹ کھانے کو مانگتا ہے' اس سے اس کی اپنی زندگی کا تسلسل وابستہ ہے۔ اسی طرح تمام حیوانات میں اپنے نسلی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے فاطرِ فطرت نے جنسی جذبہ ودیعت کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا

سکتا ہے کہ فرائڈ نے جنسی جذبہ کو انسان کے محرکاتِ عمل میں سب سے زیادہ قوی جذبہ قرار دیا ہے۔ ہم اگرچہ اس کو تسلیم نہیں کرتے' ہمارے نزدیک یہ اس کا مغالطہ 'ہے' اس کی نگاہ میں ایک چیز بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے اور انسانی فکر کا یہ خاصہ ہے کہ بسا اوقات کوئی ایک چیز انسان کے ذہن پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ باقی تمام چیزیں اسے اس کے تابع نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی معاملہ فرائڈ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی جگہ پر جنسی داعیہ ایک بہت بڑا محرک اور نہایت قوی جذبہ ہے۔

اس ضمن میں اگر ہم تاریخ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انسانوں میں افراط و تفریط کی دو انتہائیں نظر آتی ہیں۔ ایک طرف انسان نے اس جذبہ کو فی نفسہٖ شر قرار دیا کہ یہ ہے ہی سراسر برائی' یہ برائیوں کی ماں ہے۔ چنانچہ ہمیں ایک بہت بڑے طبقہ میں یہ خیال ملے گا کہ جنسی جذبہ فی نفسہٖ شر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مذاہب میں روحانی ترقی کا راستہ تجرد کی زندگی کے ذریعے سے اختیار کیا گیا کہ ساری عمر شادی بیاہ نہ کیا جائے' گھر گرہستی کا کھکھیڑ نہ پالا جائے' اس لیے کہ یہ راستہ ہے ہی برائی کا' اس میں کوئی خیر ہے ہی نہیں۔ یہ رہبانیت کا نظریہ ہے جو دنیا میں مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے رائج رہا ہے۔

اس ضمن میں دوسری انتہا یہ ہوئی کہ اپنے اس جنسی جذبہ کی آزاد اور بے قید طریق سے تسکین کرنا' اس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ کرنا اور صحیح و غلط کے فرق و امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنا 'جیسے خیالات کو روا رکھا گیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نوعِ انسانی جن بہت بڑی بڑی گمراہیوں میں مبتلا ہوئی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جذبہ کج رو

pervert ہو کر فطرت کی جو ایک معین راہ ہے اس کے بجائے دوسرے راستے اختیار کرتا ہے۔ تو تاریخ انسانی میں یہ دو انتہائیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

ان آیات میں قرآن مجید کا جو متوازن بیان ہمارے سامنے آتا ہے اس کے متعلق یہ بات اہم ہے کہ تین تین آیات دونوں مقامات پر (سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج میں) اس شان سے وارد ہوئی ہیں کہ ایک شوشے تک کا فرق نہیں ہے' اور جیسا کہ ہم آخر میں دیکھیں گے کہ یہاں سات اوصاف زیر بحث آئے ہیں جن میں سے تین پہلے ہیں' تین بعد میں ہیں' مرکزی بحث یہی ہے۔ پھر اس مسئلہ پر دونوں مقامات پر تین تین آیات وقف کی گئی ہیں۔ تو اس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان آیات میں ہمارے سامنے جو متوازن بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قانون شریعت کے دائرہ میں رہ کر حلال پر اکتفا کرتے ہوئے ایک انسان اپنے فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے تو فرمایا گیا: {فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ} کہ اس میں کوئی ملامت کی بات نہیں ہے' اس میں فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو صاف

طور پر فرمایا: ((لَا رَہبَانِیَّۃَ فِی الْاِسلَامِ)) (۱) ''اسلام میں رہبانیت بالکل نہیں ہے''۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) (۲) نکاح کرنا (شادی بیاہ کرنا' گھر گرہستی کی زندگی اختیار کرنا) میرا طریقہ ہے''۔ یہ میری سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ لہٰذا تعمیرِ سیرت اور اخلاقی ترفع حاصل کرنے کے لیے ترکِ دنیا والی روش اسلام کی روش نہیں ہے' وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ وہ آپ ﷺ کا طریقہ نہیں ہے۔

لیکن دوسری طرف اس کے لیے حدبندیاں کر دی گئیں۔ دوسرے ناجائز راستے بند کر کے نکاح کا جائز راستہ کھول دیا گیا کہ اس راستہ سے انسان اپنے جذبہ کی تسکین حاصل کرے۔ اس کے لیے حدیث میں یہاں تک فرمایا گیا کہ ایک بندۂ مؤمن کے لیے یہ عمل بھی عبادت کا ایک جزو بن جاتا ہے' جبکہ یہ فعل اس قاعدہ' اس ضابطہ اور قانون کے

---

(۱) فتح الباری لابن حجر ۹/۱۳۔ وفتح الباری لابن رجب ۱/۱۰۲۔

(۲) سنن ابن ماجہ' کتاب النکاح' باب ما جاء فی فضل النکاح۔

تابع رہ کر ہو رہا ہو جو اللہ نے اس کے لیے معین فرما دیا ہے۔

اسلام میں ملک یمین کی حیثیت

ان آیات میں ضمنی طور پر ایک مسئلہ ایسا بھی سامنے آیا ہے جس کے بارے میں بہت سے سوالات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے جو قانونی راہ ہے' اس کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید دونوں مقامات پر {اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِہِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ} کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ یعنی بیویوں کا ذکر بھی ہے اور باندیوں یا لونڈیوں کا بھی۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ بھی ہے اور بڑا تفصیل طلب بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائیں تو اِن شاء اللہ تمام اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے کہ لونڈیوں یا غلاموں کا ادارہ (institution) اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزوِ لازم نہیں ہے۔ لونڈی یا غلام رکھنا فرائض میں سے ہے نہ واجبات میں سے۔

دوسری بات یہ کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی تو معاشرے میں یہ ادارہ بالفعل موجود تھا' اور جیسے بہت سی دوسری چیزیں ایسی تھیں جو اصلاح طلب تھیں ویسے ہی یہ ادارہ بھی اصلاح طلب ادارہ کی حیثیت سے موجود تھا۔ جس طرح اسلام نے دوسری چیزوں میں اپنے اصلاحی پروگرام کو تدریجی طور پر آگے بڑھایا ایسے ہی اس معاملہ میں بھی اسلام نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں اور نبی اکرم ﷺ نے ان کا اجرا فرمایا۔ سب سے پہلی اصلاح یہ ہوئی کہ یہ بات بار بار فرمائی گئی کہ یہ لونڈی غلام تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔ یہ صرف ایک relationship ہے جو دنیا میں تمہارے اور اِن کے مابین قائم ہو گئی ہے' جیسے

ایک آجر (employer) اور ایک مستاجر (employee) ہے ‘لیکن بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ پس اگر یہ اونچ نیچ کہیں چلی آ رہی ہے کہ کوئی آقا ہے اور کوئی غلام ہے تو بحیثیت انسان وہ مساوی ہیں۔ لہٰذا آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ تم خود کھاتے ہو اپنے غلاموں کو وہی کچھ کھلاؤ‘

اور جو کچھ تم خود پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ۔ ان کے ساتھ محبت‘ شفقت اور حسن سلوک رکھو۔ ایک طرف تو یہ اخلاقی تعلیم ہے جس کے ذریعہ سے ان کی تالیفِ قلبی کی گئی۔ یعنی وہ انسان جو گرے ہوئے تھے‘ دبے ہوئے تھے‘ پسے ہوئے تھے‘ نبی اکرم ﷺ نے ان کو اس حالت سے اٹھا کر آزاد انسانوں کے برابر لانے کی کوشش فرمائی۔ اس کی دشمن بھی گواہی دیتے ہیں ۔ ایچ جی ویلز‘ جو رسول اللہ ﷺ سے بہت دشمنی رکھتا ہے‘ وہ بھی گواہی دیتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے یہ پروگرام واقعتا روبعمل لا کر دکھایا۔

تیسری بات یہ کہ اسلام نے ان کی آزادی کا ایک راستہ کھول دیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں مکاتبت کا حکم آیا ۔یعنی اگر کوئی غلام اپنے آقا سے یہ معاہدہ کرلے کہ میں اتنی رقم (اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر) تمہیں ادا کر دوں گا تو اس آقا کو ازروئے شریعت پابند کیا گیا ہے کہ وہ اس غلام کے ساتھ معاہدہ کرلے۔ اب وہ غلام محنت کرے‘ کمائی کرے اور طے شدہ رقم اپنے آقا کو دے دے تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس معاملے میں کوئی آقا انکار نہیں کر سکتا کہ میں تمہارے ساتھ یہ معاہدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ان کی آزادی کے لیے پہلی شکل یہ اختیار کی گئی۔ چنانچہ فرمایا گیا:

{وَ الَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَکَاتِبُوۡہُمۡ ...} (النور:۳۳)

’’اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں تو اُن سے مکاتبت کر لو...‘‘ {فَکَاتِبُوۡہُمۡ} فعل امر ہے اور امر وجوب کے لیے بھی آتا ہے۔ پھر تمام مسلمانوں حتیٰ کہ ان کے آقاؤں کو بھی تلقین کی گئی کہ تم اس معاملے میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور صدقہ و خیرات سے ان کی مدد کرو۔ چنانچہ اسی آیت میں جس میں مکاتبت کے لیے حکم آیا ہے‘ آگے چل کر فرمایا:

{وَّ اٰتُوۡہُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىکُمۡ} ’’اور دو اُن کو اللہ کے مال میں سے جو اُس نے تم کو دیا ہے‘‘۔ یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسان کے پاس جو مال ہے اس کی ملکیتِ حقیقی کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرما رہا ہے۔ یہ دوسری شکل ہے جو قرآن مجید نے اختیار کی۔ اس طرح ان کی تالیفِ قلبی‘ ان کے رتبہ کی بلندی اور اُن کی آزادی کی راہ نکلی۔

پھر آپ کو یاد ہو گا کہ مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے دوسرے سبق میں ہم نے حقیقی نیکی کو سمجھنے کے لیے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ کا مطالعہ کیا تھا' جسے میں "آیت ُالبر" سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ وہاں گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے عمل کو اعلیٰ ترین نیکی کے کاموں میں شمار کیا گیا ہے۔ پھر سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ کے مستحقین کی جو آٹھ مدات مقرر فرمائی گئی ہیں ان میں بھی گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے لیے زکوٰۃ سے رقم ادا کرنے کی مد بھی شامل ہے۔ مزید یہ کہ سورۃ البلد میں بڑے پیارے انداز میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ فرمایا:

{فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ ﴿۱۱﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡعَقَبَۃُ ﴿۱۲﴾}

''انسان گھاٹی کو عبور نہیں کر پایا 'اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے!'' اس گھاٹی کی جب تفصیل بیان کی گئی تو سب سے پہلے ذکر ہوا: {فَکُّ رَقَبَۃٍ ﴿۱۳﴾} ''کسی گردن کو آزاد کرا دینا''۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دفترِ فضائل کا ایک درخشاں باب یہ بھی ہے کہ آپؓ نے غلاموں اور کنیزوں کے طبقے میں سے اسلام قبول کرنے والے چھ مسلمانوں کو' جن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں' ایک خطیر رقم دے کر خریدا اور اُن کو آزاد کیا۔ حضرت عثمان ذُوالنورین رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ میں جس روز سے ایمان لایا ہوں (اور اندازہ کیجیے کہ آپؓ سابقون الاوّلون میں سے ہیں' ایمان لانے والوں میں آپؓ کا چھٹا نمبر ہے) اُس روز کے بعد سے کوئی جمعہ مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے ایک غلام آزاد نہ کیا ہو' اور اگر اتفاقاً کسی جمعہ کو میرے لیے یہ ممکن نہ ہوا تو اگلے جمعہ کو میں نے دو غلام آزاد کیے یا کرائے۔ پھر شریعت کے احکام کی بعض فروگزاشتوں کے کفارہ کے طور پر ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا یا کرانا قرار دیا گیا۔ تو یہ ہیں وہ تدابیر جو اسلام نے اس مسئلہ کی اصلاح کے لیے اختیار کیں۔

اس تیسری بات کے ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اسلام نے اس بات کو سب سے بڑے گناہوں یعنی کبائر میں سے قرار دیا ہے کہ کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنا لیا جائے۔ اسلام میں صرف اُن لوگوں کو غلام اور لونڈی بنایا گیا ہے جو خالص قتال فی سبیل

اللہ کے نتیجہ میں محاذِ جنگ پر گرفتار ہوتے تھے۔ ان کو کبھی فدیہ لے کر' کبھی بطورِ احسان اور کبھی مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں رہا کر دیا جاتا تھا۔ اگر اُن میں سے کوئی صورت مصالحِ دینی کے لحاظ سے مناسب نہ ہوتی تو ان کو مسلمان معاشرہ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اسلام نے ان کے لیے حسنِ سلوک کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات دی ہیں۔

اِس وقت دنیا میں جو سب سے زیادہ متمدن اور مہذب ترین مملکت کہلاتی ہے' یعنی امریکہ' اس میں جو کالے ہیں وہ بھلا کون ہیں؟ انہیں افریقہ سے اس طرح پکڑ کر جس طرح شکاری گھات لگا کر شکار کو زندہ پکڑتے ہیں' جہازوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح لاد کر بطورِ غلام امریکہ لے جایا گیا۔ وہاں ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی' حالانکہ وہ

اپنے ملک کے آزاد باشندے تھے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ بعد میں امریکی سوسائٹی نے کسی حد تک اپنے آباء و اَجداد کے اس جرم کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے' اس ضمن میں ابراہام لنکن کی عظمت تسلیم کی جانی چاہیے' لیکن امریکی ذہناً اب بھی کالوں کو اپنے برابر سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کچھ بھی ہوا ہے اور اُن لوگوں نے کیا ہے جو صدیوں سے بڑے متمدن اور مہذب ہونے کے مدعی چلے آرہے ہیں' جبکہ اسلام نے اس کو ایک بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ آپ کسی آزاد کو پکڑ کر غلام بنا لیں۔

اب میں چوتھی بات یہ عرض کروں گا کہ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ غلامی کی قطعی و حتمی منسوخی (final abolition) کی کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ جیسے کہ ہم شراب کے بارے میں دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں حکم آیا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ تدریجاً اصلاح کا قدم اٹھایا گیا' اور بالآخر وہ وقت آگیا کہ فرمایا گیا: {فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿ ۹۱ ﴾} (المائدۃ) ''پس کیا تم (اس سے) باز آتے ہو کہ نہیں؟'' اور: {فَاجْتَنِبُوْهُ} ''تو اب اس سے باز آ جائو''۔ اسی طرح سود کی سب سے پہلے سورۃ الروم میں اخلاقی سطح پر مذمت کی گئی۔ پھر سورۂ آل عمران میں سود در سود سے منع کیا گیا۔ پھر حرمت کی آخری آیت ۹ھ میں رسول اللہ ﷺ کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل نازل ہوگئی' جو سورۃ البقرۃ میں ہے اور جس میں ہر نوع کا سود حرامِ مطلق قرار دے دیا گیا۔ لیکن

غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں اس نوعیت کا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ ادارہ کچھ عرصہ تک چلتا رہا ہے۔

اب آپ یہ ہدایات پیش ِنظر رکھیے کہ جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ' جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ اور اُن کے ساتھ حسن ِسلوک کرو۔ پھر یہ کہ ان کی گردنوں کو چھڑانے کے لیے اخلاقی تعلیمات بھی موجود ہوں' جیسے {فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾} (البلد) اور صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ میں گردنیں چھڑانے کی مستقل مد رکھ دی گئی ہو تو ان اسلامی تدابیر کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں وہ دَور بھی آیا کہ مشرق و مغرب میں عظیم ترین مملکتیں ان کی تھیں جن کو ممالیک اور غلام کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو خاندانِ غلاماں حکمران تھا اور مصر میں جو ممالیک کی حکومت تھی تو یہ اُس اصلاحی عمل (reform) کا نتیجہ ہے جس کا آغاز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ غلاموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ غلامی سے اٹھا کر شہنشاہی تک پہنچا دیا! دنیا نے دیکھ لیا کہ غلام تخت ِہند پر متمکن ہے' وہ چاہے قطب'الدین ایبک ہو یا شمس الدین التمش جیسا درویش صفت اور ولی اللہ بادشاہ ہو۔ اسی طرح آپ کو دَورِ خلفائے راشدینؓ ' دَورِ بنو اُمیہ ؒاور دَورِ بنو عباس میں علومِ دین کی مسندوں پر بہت سے ایسے اکابر جلوہ افروز نظر آئیں گے جو آزاد کردہ غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے' اور جن کی جوتیاں سیدھی کرنا اور اٹھانا بنواُمیہ اور بنوعباس کے باجبروت بادشاہوں کے شہزادگان اپنے لیے بہت بڑی سعادت خیال کرتے تھے۔

لیکن بہرحال اگر حکمت ِخداوندی نے اس کی آخری تنسیخ نہیں کی اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی ہے جو اس ادارہ کو حتمی و قطعی طور پر منسوخ قرار دیتی ہو تو ہمیں بحیثیت ِمسلمان اللہ تعالیٰ کی حکمت ِ بالغہ پر قطعی طور پر ایمان و اعتماد رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے کہ کہیں معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ‘ نسیان سے یہ بات رہ گئی ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: {وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾} (مریم) ’’اور تمہارا ربّ بھولنے والا نہیں ہے‘‘۔ یہ معاذ اللہ کسی بھول چوک سے نہیں ہوا۔ ہمیں بہرحال اپنے علم سے اللہ کے علم کو مقدم رکھنا ہے۔ کہاں ہماری عقل اور ہماری منطق!

کہاں ہمارے فلسفے‘ جو انتہائی کوتاہ اور محدود ہیں اور کہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں!! تو وہ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت ِ بالغہ اور حکمت ِ کاملہ ہے یقیناً یہ اسی کا ظہور ہے کہ قرآن مجید میں اس کی آخری درجہ میں تنسیخ نہیں آئی!!

تعمیر سیرت کے لیے آخری تین اوصاف

زیر نظر درس میں انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے سات نکات پر مشتمل جو لائحہ عمل عطا کیا ہے‘ اب ہم اس کے آخری تین اوصاف کا مطالعہ کریں گے۔ اس لائحۂ عمل کا اوّلین اور اہم ترین نکتہ اقامۃُ الصّلٰوۃ ‘ دوسرا فعل الزّکٰوۃ‘ تیسرا اعراض عن اللّغو اور چوتھا ضبط ِنفس ‘ یعنی جنسی جذبے پر قابو یافتہ ہونا ہے۔ اس لائحۂ عمل کے آخری تین اوصاف یہ ہیں: (۱) امانت کی پاس داری (۲) ایفائے عہد (۳) اپنی شہادتوں پر قائم رہنا۔

اب اگر آپ ایک خاص اعتبار سے غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پہلے تین اوصاف کا تعلق ایک شخص کی اپنی ذات کے ساتھ ہے‘ کوئی دوسرا شخص ان سے متعلق نہیں ہوتا۔ نماز کو قائم رکھنا‘ بے کار اور بے مقصد باتوں سے اعراض‘ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا‘ یہ تو خالص ذاتی نوعیت کے اوصاف ہیں۔ چوتھا وصف وہ تھا کہ جس پر انسانی تمدن کی صحت کا دار و مدار ہے۔ اس لیے کہ انسانی تہذیب و تمدن میں خاندان کے ادارے کو جڑ اور بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ عائلی زندگی اور خاندان کے ادارے کی صحت اور استحکام کا دار و مدار اس پر ہے کہ انسان اپنے جنسی جذبہ پر قابو اور ضبط رکھتا ہو‘ اسے کسی غلط رُخ پر نہ پڑنے دے۔

اب جو آخری تین اوصاف ہیں جن پر ہمیں اجمالاً گفتگو کرنی ہے ‘ ان کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کی اس سطح سے ہے جسے ہم ملی اور سیاسی زندگی کہتے ہیں۔ یعنی حکومت کا نظام‘ نظامِ مملکت‘ قومی و ملی معاملات۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ تین اوصاف نہایت ضروری ہیں۔ ان میں سب سے پہلا وصف امانت داری اور دوسرا ایفائے عہد ہے۔

امانت داری اور پاسِ عہد کا ذکر سورۃ المعارج میں بھی ہے اور سورۃ المومنون میں بھی۔ اور دونوں جگہ پر ایک شوشے کے فرق کے بغیر بعینہٖ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں : {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ﴿۸﴾} (المومنون:۸’’المعارج:۳۲) امانتداری اور ایفائے عہد کے مابین جو ربط و تعلق ہے اور ان کی جو اہمیت ہے وہ ہمیں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ِمبارکہ سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں جو مسلسل دس برس تک آپ ﷺ کے خادمِ خاص رہے ہیں‘ اور اس کو روایت کیا ہے امام بیہقی رحمہ اللہ علیہ نے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ : قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلاَّ قَالَ ’’شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہو گا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کوئی خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں آپؐ نے یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں:‘‘ ((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ)) ’’جس میں امانت داری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں ہے‘ اور جس میں ایفائے عہد کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے‘‘۔ اس لیے کہ ایمان کا امانت داری سے گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کا مادہ ایک ہی لفظ ہے۔ ’’امن‘‘ سے ہی لفظ امانت بنا اور اسی سے ایمان بنا۔ چنانچہ یہ لازم و ملزوم ہیں‘ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان ہے تو امانت کا وصف بھی ہو گا‘ اگر امانت کا وصف نہیں ہے تو رسول اللہ ﷺ کے اس فتویٰ مبارک کی رُو سے حقیقی و قلبی ایمان بھی نہیں ہے۔ اسی طرح دین تو اصل میں نام ہے بندے اور ربّ کے مابین ایک عہد و معاہدہ کا۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں جب سورۃ الفاتحہ کی یہ مرکزی آیت پڑھتے ہیں : {اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴿۴﴾} ’’(اے ربّ !) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے‘‘۔ تو یہ اللہ کے ساتھ ایک قول و قرار‘ ایک معاہدہ اور ایک میثاق ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ کیے گئے عہد نہیں نباہ سکتا‘ جو انسانوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کر سکتا تو ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ پوری زندگی کے لیے کیا ہوا اتنا بڑا معاہدہ کیسے نباہے گا؟ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ)) ایسا شخص حقیقی دین سے تہی دست ہے۔

امانت داری اور ایفائے عہد کا ذکر سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج دونوں میں آیا ہے۔ لیکن سورۃ المعارج میں ایک تیسری چیز کا اضافہ کیا گیا ہے :{وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِشَہٰدٰتِہِمۡ قَآئِمُوۡنَ ﴿۳۳﴾} ’’اور وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم رہنے والے ہیں‘‘۔ غور طلب بات ہے کہ اس کا ذکر سورۃ المومنون میں کیوں نہیں آیا ! یہ وہ واحد مثال ہے کہ جب ہم نے دونوں مقامات کا تقابلی مطالعہ کیا تو اس کا ذکر ہمیں سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں نہیں ملا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت شہادت بھی ایک امانت ہے۔ اگر کسی وقوعہ کے وقت آپ موجود تھے‘ آپ کی موجودگی میں کسی نے کسی پر دست‘ درازی کی ہے‘ کسی نے کسی پر ظلم کیا ہے‘ کسی نے کسی کو قتل کیا ہے‘ کوئی دوسرا حادثہ ہوا ہے‘ تو

آپ کی وہاں موجودگی کی بنا پر جو شہادت آپ کے پاس ہے وہ معاشرہ' قوم و ملت اور ملک کی ایک امانت ہے۔ اگر آپ اسے چھپاتے ہیں تو آپ اس امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو چیز کسی فعل میں آپ سے آپ مضمر ہوتی ہے قرآن حکیم کہیں تو اس کا ذکر نہیں کرتا اور کہیں اس مضمر شے کو بھی عیاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ شہادت بھی درحقیقت ایک امانت ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے امانت کے تصور کو اتنی وسعت دی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ)) (۱) ''مجالس بھی امانتوں پر قائم ہیں''۔ کسی محفل میں کوئی بات ہو رہی تھی' آپ بھی اس میں موجود تھے' آپ نے وہاں کوئی بات سنی اور کہیں اور جا کر بیان کر دی جب کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی' تو یہ خیانت ہے۔ آپ نے کسی محفل کی بات کو اگر کہیں اور جا کر نقل کر دیا تو غیر شعوری یا شعوری طور پر بات میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور بات کرنے والے کے منشاء کے خلاف بھی بیان ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بات کہنے والے کے صحیح مفہوم کو سمجھ نہ پائے ہوں۔ تو نہ معلوم اس سے کتنے فتنے اٹھنے کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے! اور عین ممکن ہے کہ یہی بے احتیاطی بعض لوگوں کو بعض کے خلاف بدظنی اور بدگمانی میں مبتلا کرنے کا سبب بن جائے اور دلوں میں کدورت اور رنجش

---

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب فی نقل الحدیث۔ راوی : جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ۔

ڈیرے ڈال لے۔ تو کسی مجلس اور کسی محفل میں آپ شریک ہیں تو وہاں کی باتیں آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہیں جن کی آپ کو حفاظت کرنی ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ)) (۱) ''جس کسی سے کوئی مشورہ طلب کیا جاتا ہے گویا اس کے پاس بھی ایک امانت رکھوائی گئی ہے''۔ مشورہ طلب کرنے والے نے آپ پر اپنا اعتماد ظاہر کیا ہے۔ اب اگر آپ دیانتاً جو رائے رکھتے ہیں وہ کچھ اور ہے' لیکن آپ کسی مصلحت سے اپنی اس دیانت دارانہ رائے کو چھپا کر کوئی اور رائے ظاہر کرتے ہیں تو آپ نے اس کی امانت میں خیانت کی۔ یہ معاملہ بھی' جیسا کہ عرض کیا گیا' شہادت کا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس کے درمیان میں فرمایا گیا ہے: {وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ} (آیت ۱۴۰) ''اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا کہ جس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی شہادت ہو اور وہ اسے چھپائے!'' اس فرمانِ الٰہی اور امانت و شہادت کے حوالے سے اُمت ِمسلمہ کا جو فرضِ منصبی ہے ہمیں اسے سمجھنا چاہیے۔ ہمارے پاس اللہ کا کلام ہے' اللہ کی ہدایت ہے' اللہ کا قانون ہے اور اللہ کی شریعت ہے۔ پھر ہمارے پاس اللہ کے رسول جناب محمد ﷺ کی سنت ہے' آپ ﷺ کی احادیث ہیں۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ کامل صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ تمام امانتیں ہیں جن کو ادا کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب

سے ہمارے کاندھوں پر رکھی گئی ہے' لہٰذا ان امانتوں کو ادا کرنا پوری اُمت ِمسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس لیے کہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہیں' صرف ہمارے لیے نہیں ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا وصف رسولِ امین یعنی امانت دار رسولؐ ہے' جن کے پاس پیغامِ ربانی آیا اور انہوں نے اسے بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا' چنانچہ امانت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس پیغام کے پہلے امین ہیں' اُن کا لقب بھی رسولِ امین ہے۔ دوسرے امین جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت

---

(۱)سنن الترمذی' ابواب الزھد عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی معیشۃ اصحاب النبی۔ راوی : ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ ۔

جبرئیل علیہ السلام نے یہ امانت پہنچائی نبی اکرم ﷺ کو' اور آپ ﷺ نے یہ امانت پہنچادی اُمت کو۔ اور اسی کو ہم یوں تعبیر کریں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے اُمتؐ کے سامنے حق کی گواہی دے دی' توحید کی گواہی دے دی' اپنی رسالت کی گواہی دے دی' قرآن کی حقانیت کی گواہی دے دی' دین و شریعت کے اوامر و نواہی اور ہر ہر فعل و عمل کی گواہی دے دی' قولاً بھی اور عملاً بھی۔ اب اس امانت اور شہادت کو ادا کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ اُمت ِمسلمہ کے کاندھوں پر عائد ہوتا ہے' جس کا ہر وہ شخص ایک فرد اور رکن ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور کہلواتا ہے۔

ہمارا فرضِ منصبی یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہم اس حق کی' اس دین کی' اس توحید کی اور جناب محمد ﷺ کی رسالت کی شہادت دیں' کہ جن کے توسط سے ہمیں یہ "الہدیٰ" اور یہ "الحق" ملا ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آجاتا ہے کہ : ع

''دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی''

یہ گواہی ہمیں قولاً بھی دینی ہے اور عملاً اور فعلاً بھی۔ یہ گواہی ہم نے اپنی گفتگو' دعوت و تبلیغ اور اپنی قوتِ بیانیہ سے دینی ہے۔ یہ گواہی ہم نے اپنے قلم سے' مدلل مضامین و مقالات کی صورت میں دینی ہے' اور یہ گواہی ہمیں اپنے کردار اور اپنی سیرت سے دینی ہے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو ہم کتمانِ شہادت کے بہت بڑے مجرم ثابت ہو رہے ہیں۔ ازروئے قرآن:

{وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ } (البقرۃ:۱۴۰)

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت سے چند آیات بعد سورۃ البقرۃ میں اُمت ِمسلمہ کا فرضِ منصبی بایں الفاظِ مبارکہ بیان ہوا ہے :

{وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا ؕ} (آیت ۱۴۳)

’’ہم نے تمہیں ایک اُمت ِوسط (درمیانی اُمت) بنایا ہی اس لیے ہے کہ تم ہو جاؤ گواہ پوری نوعِ انسانی پر اور رسول (محمد ﷺ) گواہ ہو جائیں تم پر۔‘‘

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ سورۃ المومنون کی گیارہ اور سورۃ المعارج کی سترہ آیات کے باہمی تقابل

سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے اور اِن مضامین کی اہمیت بھی سامنے آ گئی ہے۔ اسی کی ایک مثال اور جان لیجیے۔ سورۃ المو ٔمنون سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے۔ سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت ہے : {قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿ ۱ ﴾} اور سورۃ الحج کی جو آخری آیت ہے اس میں اسی شہادت علی الناس کا ذکر ہے۔ مسلمانوں سے خطاب فرما کر کہا جا رہا ہے : {وَ جَاہِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ ؕ ہُوَ اجْتَبٰىکُمْ} یعنی اللہ کی راہ میں محنتیں کرو، مشقتیں کرو، ایثار کرو، قربانیاں دو، جان و مال کھپاؤ، مجاہدہ کرو، جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں امورِ نبوت کا وارث بنا دیا ہے، کتابِ الٰہی کا وارث بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ترین امانت تمہارے سپرد کی ہے، اب اس کا حق ادا کرو۔ اور اسی آیت میں ایک subordinate clause کے بعد الفاظ آئے : {لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَہِیْدًا عَلَیْکُمْ وَ تَکُوْنُوْا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ} (آیت ۷۸) ’’تاکہ رسول (ﷺ) گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ پوری نوعِ انسانی پر‘‘۔ تو یہ ہے پوری اُمت ِمسلمہ کی اجتماعی (collective) ذمہ داری جو شہادت کے اس لفظ کے حوالے سے ہمیں جان لینی چاہیے۔

ان آیات کے ذریعے تین اوصاف پاس امانت، پاسِ عہد اور شہادت کی ادائیگی کے بعد سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج دونوں میں اوّلین اور اہم ترین وصف یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور اس کی حفاظت کے وصف کا اعادہ فرمایا گیا: {وَ الَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَوٰتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ ۘ﴿ ۹ ﴾} (المومنون) اور {وَ الَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴ ؕ﴾} (المعارج) کے الفاظ میں پھر سورۃ المومنون میں فرمایا گیا : {اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ ﴿ ۱۱ ﴾} اور سورۃ المعارج میں ارشاد ہوا: {اُولٰٓئِکَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّکْرَمُوْنَ ﴿ ٪۳۵ ﴾} کہ یہ ہیں وہ لوگ جو جنت الفردوس کے وارث بنیں گے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا اعزاز و اکرام ہو گا جنتوں میں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اوصاف کو اپنی شخصیتوں میں پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی جنت میں داخل ہونے والوں میں شامل کر دے۔ آمین یاربّ العالمین !

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين